blood-stained story ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہی حال دوسرے version کا ہے۔ اس نوع کے ترجمے اصل کے ساتھ جو غارتگرانہ سلوک روا رکھتے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

آج اکیسویں صدی میں ترسیل وابلاغ کے جدید انکشافات و ایجادات نے تہذیب نو گلوبلائزیشن کے تحت منصوبہ بند کر دیا ہے۔ ایسے میں مشینی ترجمہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ یہاں ایم علی کے حوالے سے ایک دوسری مثال دینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے جانکاری دی ہے کہ ترجمہ اور ڈیکوڈنگ کے لیے مشینوں کے استعمال کی ضرورت پر سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں ایک خاکہ بنایا گیا جسے A.C.Both نے عملی شکل دی۔ ۱۹۵۴ء میں اس کی ایجاد کردہ مشین دنیا کے سامنے تھی۔ w.weinex کی مشین بھی ذولسانی لغت ثابت ہوئی اور ۱۹۷۰ء تک ان مشینوں کو اعراب سے آگاہ کیا گیا۔ اوقاف رموز کے آداب سکھائے گئے۔ املا کی غلطیوں سے بچنے کی ترکیبیں بتائی گئیں۔ غرض شعور سے متصف کیا گیا۔ اس طرح مشینوں نے automatic language processing system کے سہارے تیز ترجمہ کرنا شروع کر دیا لیکن آوازوں کی مدد سے حاصل کیے گئے تراجم خامیوں کے شکار ہوئے۔ ایم علی کی دی ہوئی ایک مثال اسی طرح ہے کہ پاکستان کے کسی سیمینار میں ایک مقرر نے غلط ترجمے کے حوالے سے اخبار میں چھپی ایک خبر کا ٹکڑا پڑھا:

A woman was shot dead in a temple

(یہاں کسی مندر میں ایک قتل کے واقعہ کا ذکر ہے)

اگر صرف مذکورہ جملے کو سامنے رکھا جائے تو ترجمہ نگار نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ویسے temple کے کئی مفاہیم ہیں۔ مثلاً:

۱۔ عبادت گاہ ۲۔ ذات الٰہی کا مستقر ۳۔ نسائی جسم ۴۔ یہودیوں کا ایک مقدس مقام ۵۔ صومعہ ۶۔ کنشت ۷۔ کرگھے میں استعمال ہونے والی ایک لکڑی ۸۔ عیسائیوں کا معبد ۹۔ مندر ۱۰۔ کنپٹی ۱۱۔ فرانس کے پروٹسٹنٹ فرقے کا ایک گرجا۔

جہاں تک انگریزی کے اس مذکورہ جملہ کے اردو ترجمہ کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔ یہاں ترجمہ کی غلطی نہیں بلکہ واقعہ کی غلطی ہے کیونکہ اس عورت کو مندر میں نہیں بلکہ کنپٹی میں گولی ماری گئی تھی۔

قرأت، الفاظ کی معنویت، فکر کی اکائی اور حذف و اضافہ کی خیال بنی کا عرفان ترجمہ نگار کے لیے لازمی عمل ہیں۔

(بشکریہ ماہنامہ شاعر بمبئی، اگست ۲۰۱۴ء)

آسیہ رانی
شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور کینٹ، لاہور

موجودہ دور میں خواتین اساتذہ میں مطالعے کا رجحان

ہم نشینی اگر کتاب سے ہو
اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں

کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے:

"A good book is like a garden carried in the pocket"

کتاب خوبصورتی اور تحیّر سے بھرپور ہوتی ہے۔ کتابوں میں انسان کی صدیوں کی عقل و دانش اور تجربات کا نچوڑ موجود ہوتا ہے۔ جو شخص بھی مطالعے کا شوق رکھتا ہے وہ ان تجربات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مطالعہ ایک ایسی دوربین کی مانند ہے جس کی مدد سے انسان ایک ہی جگہ بیٹھ کر دنیا کے گوشے گوشے کو دیکھ سکتا ہے۔ موجودہ سائنسی اور مشینی دور میں تو مطالعے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، مطالعے کے ذریعے ہی انسان اس تیز رفتار دور میں اپنی معلومات میں ہر لمحہ اضافہ کر سکتا ہے اور زاویہ نظر کو وسعت دے سکتا ہے۔ ایک استاد کے لیے مطالعے کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اگر استاد کی معلومات وسیع اور ہمہ جہت ہوں گی تبھی وہ اپنے طلبا کی علمی پیاس بجھا سکے گا۔ وہ ان صدیوں پر محیط تجربات اور علم و دانش کو اپنے طلبا کے ذہن میں انڈیل سکے گا جس نے انسان کو موجودہ دور تک پہنچایا ہے۔

اساتذہ کے اسی ذوق مطالعہ کی جانچ کے لیے کالج کی سطح کے ایک تعلیمی ادارے کی ۳۵ خواتین اساتذہ سے "اساتذہ میں مطالعے کی عادت" کے عنوان سے ایک سوال نامہ پُر کروایا گیا۔ یہ اساتذہ مختلف شعبوں جن میں اُردو، انگریزی، پنجابی، فارسی، معاشیات، نفسیات، سیاسیات، شماریات، طبیعیات، علم نباتات، علم حیوانات، کیمیا، اسلامیات، علم التعلیم، علم صحتِ جسمانی اور ریاضی شامل ہیں، سے تعلق رکھتے تھے۔ سوال نامے میں ۲۰ سوالات شامل تھے جن کی مدد سے اساتذہ میں مطالعے کے رجحان کا اندازہ لگایا گیا۔ سوال نامے سے حاصل ہونے والے نتائج کے مطابق ان ۳۵ اساتذہ میں ۹۷ فیصد میں مطالعے کا شوق پایا جاتا ہے جب کہ ۳ فیصد اساتذہ نے اقرار کیا کہ وہ مطالعے کا بالکل شوق نہیں رکھتے۔ ۸۲ فیصد اساتذہ نے کہا کہ گھر اور ملازمت کی ذمہ داریوں کے باوجود مطالعے کے لیے ضرور وقت نکالتی ہیں، خاص طور پر رات کو سوتے ہوئے کوئی کتاب پڑھنا ان کا معمول ہے۔ ۱۸ فیصد اساتذہ نے کہا کہ وہ مطالعے کے لیے وقت نہیں نکال پاتیں۔ کچھ اساتذہ نے کہا کہ وہ مطالعے کا بے حد شوق رکھتی ہیں لیکن بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے ان کے لیے مطالعہ کرنا ممکن نہیں رہا۔

سوال نامے کا تیسرا سوال یہ تھا کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھنا پسند کرتی ہیں تو ۲۶ فیصد نے اُردو ادب، ۹ فیصد نے اسلامی کتابیں، ۶ فیصد نے تعلقات عامہ، ۳ فیصد نے فائن آرٹس، ۳ فیصد نے ہوم اکنامکس اور گھریلو سجاوٹ، ۱۵ فیصد نے اسلامیات اور تاریخ، ۸ فیصد نے ادبی و مذہبی، ۱۱ فیصد نے اُردو، انگریزی، نفسیات اور ۸ فیصد نے ہر قسم کی کتابیں پڑھنے میں دلچسپی ظاہر کی جب کہ ۱۱ فیصد اساتذہ نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سوالنامے کا چوتھا سوال اپنے مضمون کے علاوہ کسی دوسرے مضمون میں دلچسپی کے متعلق تھا۔ اس سوال کے جواب میں ۶ فیصد نے مزاحیہ ادب، ۳ فیصد نے کوکنگ، ڈریس ڈیزائننگ اور شعروشاعری، ۱۵ فیصد نے اسلامی، ۲۹ فیصد نے متفرق مضامین تاریخ اسلامی، تاریخ عالم، ہوم اکنامکس، علم نباتات وحیوانات، فائن آرٹس اور جغرافیہ، ۳ فیصد نے حالات حاضرہ، ۲۵ فیصد نے ادب اور مذہب، ۱۵ فیصد نے اردو و انگریزی ادب کے مضامین میں دلچسپی کا اظہار کیا جب کہ ۵ فیصد اساتذہ نے لکھا کہ وہ سائنس کے علاوہ ہر مضمون میں دل چسپی رکھتی ہیں۔

اگلا سوال پاپولر ادب کے مطالعے سے متعلق تھا۔ ہمارے ہاں پاپولر ادب خاص طور پر خواتین کے مخصوص رسالے، کھانا پکانے سے متعلق رسائل، اخبار جہاں اور اُردو ڈائجسٹ دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ۴۹ فیصد اساتذہ نے جواب دیا کہ وہ پاپولر ادب نہیں پڑھتیں بلکہ معیاری اور اعلیٰ درجے کا ادب پڑھنا پسند کرتی ہیں جب کہ ۵۱ فیصد خواتین اساتذہ نے پاپولر ادب میں دل چسپی ظاہر کی۔ چند اساتذہ تو اُردو ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔

سوال نامے کا چھٹا سوال یہ تھا کہ شاعری یا نثر میں سے کس صنف کا مطالعہ زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ۱۵ فیصد نے شاعری، ۳۱ فیصد نے نثر اور ۵۴ فیصد نے دونوں اصناف کو پسند کرنے کا دعویٰ کیا۔ پسندیدہ شاعر یا مصنف کے بارے میں استفسار پر متنوع لکھاریوں کے نام لیے گئے۔ ان

مناظر عاشق ہرگانوی (بھارت)

ترجمہ نگاری کا فن

ترجمہ (Translation) کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے پہنچا ہے۔جس کے لغوی معنی ''پار لے جانا'' ہے۔

ترجمہ وہ واحد ذریعہ ہے، جس کی بدولت دنیا میں مختلف تقاضوں کی حامل متفرق زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے خیالات ،نظریات ،تفہیمات ،ادبیات ،روایات اور خواہشات وغیرہ سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔

کوئی قوم علوم وفنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ بناتی ہے۔اس میں معاشرہ اور ادب دونوں شامل ہیں۔

ترجمہ میں اس زبان کے بولنے والے کے ذوق وجدان سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ترجمہ کو رواں، دواں، عام فہم، زود اثر اور ادبی رعنائی کا حامل ہونا چاہیے۔

ترجمہ دو تہذیبوں کے درمیان پل بناتا ہے۔جس کے ذریعہ افکار و خیالات ،تکنیک اور اسلوب کا دوطرفہ سفر جاری وساری رہتا ہے۔

ترجمہ کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحریری ترجموں کے تین طریقے سے بحث کی ہے۔ ایک یہ کہ لفظوں کے آہنگ ،مصنف کے لہجے، بیان کے تیور اور ابلاغ کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے ،دراصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس۔اسے ترجمہ کرنا نہیں کہتے مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی اپنی زبان کے روایتی و مقبول انداز بیان کی مدد سے ترجمہ کر دیا جائے۔جہاں جی میں آیا حسب دل خواہ تبدیلی بھی کر لی۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک اور آہنگ بھی باقی رہے۔اپنی زبان کا مزاج بھی بنیادی طور پر موجود رہے اور ترجمہ اصل متن کے مطابق بھی ہو۔ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ایسا ترجمہ جس میں مترجم نے مصنف کی اصل روح کو پا کر اپنی زبان کے مزاج میں نگینے کی طرح بٹھا دیا ہو ایک ایسا ہی گوہر نایاب ہے جیسے ادب کا کوئی شہ پارہ جو کبھی کبھار وجود میں آکر کسی تہذیب کی ساری روح کا مظہر بن جاتا ہے۔ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ بیان کا نیا ڈھنگ اور اسلوب کا ایک نیا امکان آجاتا ہے۔دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کرکے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے۔

ترجمہ کے فن سے بحث کرتے ہوئے جارج سٹائز نے لکھا ہے کہ ننانوے فی صد تراجم ناقص ہوتے ہیں۔ترجمے کی بہت سی اقسام ہیں کہ یہ کام تو بازار سے لے

کوئی قوم علوم وفنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ بناتی ہے۔اس میں معاشرہ اور ادب دونوں شامل ہیں

کر اقوام متحدہ تک اور اخبار سے لے کر وی سی آر تک کسی نہ کسی شکل میں چلتا ہی رہتا ہے۔عام زندگی میں بھی ترجمے کا معیار قدرے بہتر ہوسکتا ہے۔اگر اسے فن کے طور پر نہ سہی، ایک روزمرہ ہنر کی طرح سے سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کیا جائے۔فن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ محض تعلیم و تعلم سے نہیں آتا اگرچہ اس میں بھی ایک عنصر ہنر کا ضرور ہوتا ہے جو ماہرانہ تربیت سے نکھر سکتا ہے لیکن ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔متن کی زبان اور اپنی زبان تو خیر آنی ہی چاہیے۔اس موضوع سے بھی طبعی مناسبت درکار ہے جو متن میں موجود ہے۔مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور اس صنف ادب یا شاخ علم سے بھی جس سے متن پیوست ہے، مترجم کو پیوستگی حاصل ہو تب شاید ترجمہ رواں معیار سے بہتر ہو۔

ترجمے کے فن کو اعتبار بخشتے ہوئے آر ایچ زوبنر کا کہنا ہے کہ ترجمے کے میدان میں درجہ کمال کی تحصیل ایک قسم کا فن ہے۔جس میں دونوں زبانوں کے فنی امکانات کے سلسلے میں ذاتی اور انفرادی حساسیت کی اہمیت سب سے مافوق ہے لیکن یہ امکانات کہاں تک جاسکتے ہیں۔اس کا اندازہ ترجمے کی مشکلات کی فہرست بنا کر نہیں ہوسکتا۔اس لیے کہ تخلیقی ترجمہ ایک ایسے اتفاقی حادثے کا نام ہے۔جس کی پیش بینی نہیں ہو سکتی۔

شاعری کے ترجمہ کے سلسلے میں بیشتر دانشوروں کی رائے ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے یعنی شاعری کا ترجمہ صحیح اور مکمل طور پر نہیں ہوسکتا کہ اس کا ایک جداگانہ لسانی عمل ہے اور ہر طرح کی شاعری اپنا وجود رکھتی ہے۔

اردو میں بھی ترجمے ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔انتقال معنی پر زور بھی دیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر ترجمے روح سے عاری ہیں۔اس بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری کی رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مثال دے کر بتانے کی کوشش کی ہے کہ غلط مفروضوں کے علاوہ ترجمے میں جس آزادی اور فیاضی کے ساتھ تحریف وتغیر کو روا رکھا جاتا ہے یا اپنی طرف سے الفاظ کے ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔وہ ترجمہ کو اصل سے کوسوں دور لے جاتے ہیں۔اس نوع کی مثالوں کی اردو میں کمی نہیں۔اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے بھی افراط و تفریط کے شکار ہو جاتے ہیں۔انھوں نے رالف رسل کے غالب کے ایک شعر کے انگریزی ترجمے کی مثال دی ہے۔غالب کا شعر ہے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

رالف رسل نے اس شعر کے دو versions دیئے ہیں:

i wrote the blood stained story of may love
And wrote on, though my hands were smitten off,
i filled the blood-stained pages with the story of may love
And went on writting even when they had cut off my hands.

حامدی کاشمیری لکھتے ہیں: اس ترجمہ پر بلاشبہ 'من چہ سرایم وطنبورہ من چہ سراید' کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ترجمہ کارنے اصل شعر کی لسانی ساخت کو کلیتاً نظر انداز کیا ہے اور شعر کی جو درگت بنائی ہے وہ قابل افسوس ہے۔اس شعر کے پہلے version کو لیجیے۔اس میں من مانے طریقے سے لکھتے رہے، کا ترجمہ i wrote ،جنوں کا love ،حکایات خونچکاں کا

کے دیگر ایسے ممالک میں جہاں ملکی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا جس میں چین، جاپان، انڈونیشیا وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں سب سے پہلے ترجمہ کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور بڑے بڑے ''ترجمہ گھر'' یا ''ٹرانسلیشن ہاؤسز'' کی بنیاد رکھی گئی۔ جہاں نہ صرف سرکاری دستاویزات بلکہ تمام علوم وفنون کی ہر آنے والی نئی کتاب کو جلد از جلد اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اردو کے بطور سرکاری زبان نفاذ کے حوالے سے اگرچہ فی الوقت پاکستان میں ایسے کسی ادارے کی بنیاد نہیں رکھی گئی تاہم انجمن ترقی اردو، اردو لغت بورڈ، اردو سائنس بورڈ، شعبہ تالیف وترجمہ جامعہ کراچی اور ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) نے اردو میں دفتری امور کی انجام دہی کے لیے سرکاری مراسلت، اصطلاحات، لغات اور دیگر حوالوں سے بہت سا بنیادی کام مکمل کر رکھا ہے جس سے مستقبل میں روزمرہ کی مراسلت اردو زبان میں سرانجام دینے اور سرکاری وزارتوں، محکموں اور اداروں کے ضروری ریکارڈ قوانین اور قواعد وضوابط کو دفتری ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اردو میں ترجمہ کرنے میں یقیناً معاونت حاصل ہوگی"۔

اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کے حوالے سے اردو ترجمہ کرتے وقت درج ذیل بنیادی غور طلب امور ہیں:

۱۔ انگریزی سے اردو زبان میں سرکاری مراسلت، قانونی دستاویزات، آرکائیوز، بل، فارم یا دیگر کسی بھی قسم کے ترجمہ کا کام تفویض کرتے وقت سب سے پہلے اس امر کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ متعلقہ مترجم کو انگریزی اور اردو، دونوں زبانوں پر مکمل دسترس حاصل ہو جیسا کہ مترجم چاہے اردو زبان پر کتنا ہی عبور کیوں نہ رکھتا ہو، جب تک انگریزی متن کے مکمل مفہوم سے آگاہ نہیں ہوگا، معیاری اور درست ترجمہ کرنے سے قاصر رہے گا۔

۲۔ بشمول دیگر بیشتر مغربی زبانوں کے، انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت جملہ کی ساخت کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے مثلاً انگریزی زبان میں فاعل اور مفعول یعنی Subject اور Verb پہلے آتے ہیں جبکہ اردو میں جملے کی ساخت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے اور فعل جملے کے آخر میں آتا ہے۔ بیشتر مترجمین جملے کی ساخت کے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور لفظ بلفظ ترجمہ کر دیتے ہیں جس سے ترجمہ کے بعد نتیجتاً ایک بے ربط جملہ وضع ہوتا ہے۔ مزید برآں انگریزی میں لمبے جملے بسا اوقات پورے پیراگراف پر محیط ہوتے ہیں جن کا ترجمہ کرتے وقت جملے کا آخری حصہ ترجمہ شدہ عبارت میں سب سے پہلے بھی آ سکتا ہے۔ چنانچہ جملے کی اس ساخت کو سمجھنا مترجم کے لیے بے حد ضروری ہے۔ قانونی دستاویزات اور قواعد وضوابط میں اس امر کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ طویل جملوں کی صورت میں اس امر کو پیش نظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ مطلب واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو۔ صحافت کے معروف استاد مسکین علی حجازی اپنی کتاب "فن ادارت" (صفحہ ۲۹۶) میں لکھتے ہیں کہ "اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں"۔

۳۔ ۴۳ قبل مسیح کے معروف رومی فلاسفر، سیاستدان، ماہر قانون، مقرر اور آئینی اور سیاسی نظریہ ساز سسیرو کے

اردو کو سرکاری زبان کے طور پر اختیار کرنے کے حوالے سے تراجم کی ضرورت اور ذمہ داری صرف چند قوائد وضوابط، دستاویزات اور روزمرہ کی مراسلت کے ترجمے تک محدود نہیں بلکہ اس کے لیے ہمیں اپنے بنیادی نکتہ نگاہ میں مثبت تبدیلی اور ایک معتدل رویہ اپنانے کی ضرورت ہے

الفاظ "مترجم کا کام لفظ کی جگہ لفظ رکھنا نہیں بلکہ مصنف کے اسلوب کی طاقت کو اپنی زبان میں محفوظ کرنا ہے"۔

سرکاری دستاویزات اور دفتری ضروریات سے عہدہ برآ ہونے والا ترجمہ اگرچہ ادبی کاموں کے ترجمے سے آسان ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ صورت میں مترجم کا اس ملک کے تہذیبی رچاؤ اور علاقائی پس منظر سے واقف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے جس کے متعلقہ ادب کو وہ ترجمہ کے ذریعے دوسری زبان میں منتقل کر رہا ہوتا ہے۔ تاہم سرکاری تراجم کی انجام دہی کے وقت بھی مترجم کا متعلقہ ادارے کے مزاج کی نوعیت، ذمہ داریوں اور ماحول سے کسی حد تک واقف ہونا ضروری ہے۔ مثلاً کسی سائنسی ادارے کی دستاویزات اور مراسلت کا ترجمہ اور کسی فنون لطیفہ کے ادارے کی دستاویزات کا ترجمہ، مختلف اسلوب اور ذخیرۂ الفاظ کا متقاضی ہے۔

۴۔ سرکاری قوانین، قواعد وضوابط اور دیگر دستاویزات نیز روزمرہ کی مراسلت کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کسی بھی انگریزی لفظ کا ترجمہ، ترجمہ شدہ دستاویز کے ہر مقام پر یکساں ہو، ماسوائے اس کے، کہ متن (Text) کی ضرورت اس کے برعکس ہو مثال کے طور پر "Defence" کا ترجمہ اگر دستاویز میں "دفاع" کیا جا رہا ہے تو کہیں "بچاؤ" اور کہیں "حفاظت" یا "تحفظ" نہ تحریر کیا جائے تاہم اگر کہیں Defensive درج ہو تو متن کی ضرورت کے مطابق اس کا ترجمہ مدافعانہ یا مزاحمت پذیر کرنا بہتر ہوگا۔ اسی طرح "Active" کا ترجمہ "ہوشیار، سرگرم یا مستعد" کیا جا رہا ہے تو پوری دستاویز میں مختلف مقامات پر تینوں الفاظ نہیں بلکہ ایک ہی لفظ کا استعمال کیا جائے۔ سائنسی اور تکنیکی دستاویزات میں اصطلاحات کے ترجمہ کے حوالے سے یہ احتیاط بطور خاص ملحوظ رکھنی چاہیے"۔

۵۔ اصطلاحات اور تکنیکی امور کا ترجمہ کرتے وقت رائج الفاظ کو فوقیت دینی چاہیے نیز انگریزی کے وہ الفاظ جو اب روزمرہ کی زبان کا حصہ بن چکے ہیں اور عام فہم ہیں انہیں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں مثال کے طور پر ٹیلی فون، ٹرانسفارمر، ٹیلی ویژن اور بل وغیرہ، تاہم اگر کوئی آسان متبادل موجود ہے تو اسی کا استعمال کیا جانا چاہیے مثال کے طور پر Vacancy کے لیے "اسامی" کا لفظ یا Application کے لیے درخواست کا لفظ یا "Leave with pay" اور "Leave without pay" کے لیے "رخصت با تنخواہ" اور رخصت بلا تنخواہ کی اصطلاح کسی کے لیے اجنبی نہیں۔

۶۔ انگریزی کی فنی اصطلاح کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اردو میں ترجمہ شدہ لفظ بھی اصطلاح کا درجہ رکھتا ہو۔ تاہم اختصار کے ساتھ اس میں مکمل مفہوم موجود ہو۔ مثال کے طور پر Judge کے لیے "انصاف کرنے والا" نہیں بلکہ "منصف" یا Irrigation کے لیے "فصلوں کو پانی لگانا" نہیں بلکہ آب پاشی تحریر کیا جائے۔

۷۔ اردو ہمارے ملک کی صرف ایک قلیل آبادی کی مادری زبان ہے۔ پنجابی زبان کی تذکیر وتانیث کسی حد تک اردو سے مشابہ ہے تاہم دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے مترجمین کے لیے نہ صرف متعلقہ ذخیرۂ الفاظ سے واقفیت ضروری ہے بلکہ انھیں ترجمہ کی انجام دہی کے دوران اردو تذکیر وتانیث کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔

۸۔ انگریزی کے ملتے جلتے الفاظ اور اصطلاحات

کے اردو ترجمہ کے وقت مترجمین کو یہ خاص احتیاط برتنی چاہیے کہ ہر لفظ یا اصطلاح کا ترجمہ واضح ہو مثال کے طور پر درج ذیل تین ملتے جلتے الفاظ

Conciliation ------ ثالثی

Mediation ------ مصالحت

Resolution ------ تصفیہ

۹۔ نئی اصطلاحات وضع کرتے وقت اگر کوئی مروج مقامی اصطلاح موجود ہے۔ عربی یا فارسی کی مشکل اصطلاحات کی بجائے تو اسے اپنانا زیادہ مناسب ہوگا جیسا کہ کم از کم آبادی کے کچھ حصے کے لیے یہ مانوس ہوگی۔ مثال کے طور پر فوجی جوان اکثر Burst of Fire کے لیے چھٹے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

۱۰۔ اردو کے بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کے حوالے سے ایک اچھے مترجم کا اسمائے معرفہ اور مقامات سے کسی حد تک واقف ہونا بھی ضروری ہے تا کہ وہ انھیں درست ادائیگی کے ساتھ تحریر کر سکے۔ مثال کے طور پر "Lardkana" لارڈ کانہ" لکھا جائے گا مگر "Kharadar یا Gawadar" کھارادر یا گوادر لکھا جائے گا جیسا کہ لارڈ کانہ میں "d" کی آواز "ڑ" اور کھارادر یا گوادر میں "د" کو ظاہر کرتی ہے، نیز بعض صورتوں میں مقامات کے انگریزی ناموں کا اردو ترجمہ مختلف ہوتا ہے جیسے Syria کے لیے شام اور مصر کے لیے Egypt کا نام استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز palestine کو فلسطین اور Jordan کو اردن تحریر کیا جاتا ہے اس لیے مقامات یا ناموں کے اسمائے معرفہ کے حوالے سے شک شبہ کی صورت میں تحقیق کے بعد ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ نیز سائنسی اور تکنیکی دستاویزات کے ترجمہ کے حوالے سے یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ ایسے ترجمے متعلقہ ماہرین مضمون ہی سرانجام دیں جیسا کہ صرف اصطلاحات کے ترجمہ سے متن کے مفہوم کی صحیح ادائیگی ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے متعلقہ مضمون سے باقاعدہ واقفیت اور پس منظر کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۱۔ سرکاری دستاویزات اور قواعد وضوابط کے ترجمے کے حوالے سے ایک انتہائی اہم معاملہ ہندسوں اور انگریزی حروف تہجی کی تحریر کا ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل امور کو مدنظر رکھنا مترجم کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

(i) روزمرہ کی عام مراسلت یا عمومی دستاویزات میں اگر انگریزی ہندسے تبدیل کیے گئے ہیں تو یہ عمل پوری مراسلت یا دستاویز میں یکساں رکھا جائے۔ اسی طرح a, b, c کو اگر الف، ب، ج سے تبدیل کیا گیا ہے تو یہ عمل بھی تمام مراسلت یا پوری دستاویز میں یکساں ہونا چاہیے۔ تاہم اردو ابجد کو انگریزی زبان میں a,b,c.d کی طرز پر نہیں بلکہ ا ب ج د، ہ کی ایک مخصوص ترتیب میں لکھا جاتا ہے۔

(ii) قانونی دستاویز مثلاً کسی ادارے کے ایکٹ، آئین پاکستان کے کسی حصے، اسمبلی کی کسی قانونی دستاویز یا قواعد وضوابط کی صورت میں انگریزی ہندسوں اور قانون کی مختلف شقوں یا دفعات کو بیان کرنے والے عنوانات کے ساتھ موجود انگریزی کے حروف تہجی کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ جیسا کہ فی الوقت عدالتوں اور کسی بھی قانونی کارروائی کے دوران حتمی حوالہ انگریزی کی دستاویز کا قرار دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر اردو کی ترجمہ شدہ دستاویز میں 58-e کو ۵۸۔ ہ لکھا ہوگا تو حوالہ تلاش کرنے میں خاطر خواہ دشواری ہوگی۔

سرکاری قوانین، قواعد وضوابط اور دیگر دستاویزات نیز روزمرہ کی مراسلت کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کسی بھی انگریزی لفظ کا ترجمہ، ترجمہ شدہ دستاویز کے ہر مقام پر یکساں ہو، ماسوائے اس کے، کہ متن (Text) کی ضرورت اس کے برعکس ہو

(iii) قانونی دستاویزات اور قواعد وضوابط کے ذیلی نکات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیے گئے رومن ہندسوں مثلاً (i)، (ii)، (iv) کو بھی اسی طرح تحریر کیا جانا چاہیے جیسے وہ اصل عبارت میں درج ہیں۔

۱۲۔ موجودہ دور میں ترجمے کے ساتھ کمپوزنگ کا عمل بھی لازم وملزوم ہے۔ کوشش کی جانی چاہیے کہ کمپوزنگ کے دوران بھی انگریزی متن کے "لے آؤٹ" اور سرخیوں کی ترتیب اور فونٹ سائز کو بحال رکھا جائے تا کہ ترجمہ شدہ متن اور اصل کے ساتھ تقابل کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

اردو کو سرکاری زبان کے طور پر اختیار کرنے کے حوالے سے تراجم کی ضرورت اور ذمہ داری صرف چند قوائد و ضوابط، دستاویزات اور روزمرہ کی مراسلت کے ترجمے تک محدود نہیں بلکہ اس کے لیے ہمیں اپنے بنیادی نکتہ نگاہ میں مثبت تبدیلی اور ایک معتدل رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ صرف اور صرف اسی صورت میں انگریزی سے اردو میں منتقلی کا یہ سفر آسان اور باثمر ہوگا۔ مقابلے کا امتحان پاس کر کے آنے والے ایک سرکاری افسر کی یہ سوچ بھی اس عمل کے لیے ضرررساں ثابت ہوگی کہ ''اردو میں خط لکھنے سے اس کی شان وشوکت یا وقار میں کمی ہو جائے گی'' اسی طرح اردو پر دسترس رکھنے والا اس حقیقت کو فراموش نہ کرے کہ انگریزی کی ایک بین الاقوامی حیثیت ہے جسے جھٹلانا ممکن نہیں ترجمہ کا عمل دفتری امور کی انجام دہی کے دوران ہمہ وقت جاری رہنے والی چیز ہے اور اس حوالے سے اردو زبان کے ساتھ ہماری وابستگی اور خلوص کے ساتھ اس کا عملی نفاذ ہی اس کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے میں ہمارا سب سے بڑا مددگار ہوگا۔

(ایئر یونیورسٹی اسلام آباد میں ''زبان کی پالیسی'' کے حوالے سے منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا)

اخبار اردو کے نام..........

ستمبر اکتوبر ۲۰۱۶ء کا اخبار اردو مل گیا۔ ٹی ہاؤس والے مضمون کو آپ نے بہت خوبی سے شائع کیا ہے، میری جانب سے شکریہ قبول کیجیے۔ فی الحال میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے مکالمہ ہی پڑھ سکا ہوں۔ اس لیے پورے پرچے پر انشااللہ نئے سال میں کچھ لکھ سکوں گا، فہرست مضامین خاصی بھاری بھرکم ہے اور ان میں سے ہر ایک مضمون پوری توجہ کا طالب ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی رجوع کروں گا۔

..........سید راشد اشرف، لندن

..........O

ستمبر اکتوبر کا شمارہ اپنے اندر بہترین ادبی و اصلاحی معلومات سمیٹے ہوئے تھا۔ خاص طور پر سید راشد اشرف کا مضمون ''پچاس کی دہائی کا پاک ٹی ہاؤس'' ٹی ہاؤس کی تاریخی معلومات سے لبریز تھا اور امجد بٹ کا مضمون ''اردو کو دفتری زبان کیوں بنایا جائے؟'' تو رسالے کی جان تھا۔ امجد صاحب نے اردو کو دفتری زبان بنانے کے حوالے سے بہترین تجاویز پیش کی ہیں۔ انگریزی زبان کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ملکی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ترجیحی بنیادوں پر اردو زبان کا نفاذ بطور قومی و دفتری زبان کیا جائے۔

..........اسد شریف، سامارو موری، سندھ

O

اخبار اردو کا پرانا قاری ہوں، دعا گو رہتا ہوں کہ یہ رسالہ جسے آپ سب انتہائی محنت شاقہ سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جاری و ساری رہے اور اردو کے فروغ کے لیے آپ کی کاوشیں رنگ لائیں۔

..........حیدر نقوی، کوہاٹ

☆☆☆

نبیلہ پیرزادہ، اسلام آباد

ترجمے کے غور طلب امور اور مسائل

الف۔ پس منظر

اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کے حوالے سے ترجمہ کے غور طلب امور اور مسائل کے ادراک اور تفصیلی بحث پر باقاعدہ آغاز سے قبل اردو کے بطور سرکاری زبان نفاذ کے حوالے سے ایک مختصر پس منظر کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ اس حوالے سے میں اپنی بات کا آغاز بابائے قوم محمد علی جناح کے قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد کے درج ذیل دو ارشادات سے کرنا چاہوں گی۔

☆ قیام پاکستان سے قبل قائداعظم محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں ہونے والے اجلاس میں فرمایا:

"میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی"

☆ قیام پاکستان کے بعد ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی بات کا دوبارہ اعادہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور صرف اردو۔۔۔۔۔۔ اور اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔۔۔۔۔۔"

تاہم اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کی باقاعدہ قانون سازی ۱۹۷۳ء میں کی گئی۔ جب ۱۹۷۳ء کے آئین کی شق (۱) ۲۵۱ کے تحت اردو کے بطور سرکاری زبان نفاذ کے لیے ۱۵ سال کی زیادہ سے زیادہ مدت مقرر کی گئی تھی۔ حکومت آزاد کشمیر کی سرکاری زبان ۱۹۴۷ء سے ہی اردو تھی جس کا ۱۹۷۳ء کے آئین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح برطانوی دور سے ہی سرحد، پنجاب اور بلوچستان کے صوبوں اور بہاولپور، قلات جیسی اکثر ریاستوں میں پاکستان کے ماتحت عدالتوں اور چند دیگر اداروں میں بھی سرکاری امور اردو زبان میں انجام دیے جانے لگے تھے لیکن ۱۹۸۸ء میں یہ مدت پوری ہونے کے بعد بھی آئین کے اس فیصلہ پر مکمل عملدرآمد نہ ہو سکا تاہم چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس جواد ایس خواجہ نے ۹ ستمبر ۲۰۱۵ء کو اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک روز قبل اس تاریخی فیصلہ کا اعلان کر دیا جس کے تحت تمام تر وزارتوں، اداروں اور محکموں میں اردو کو آئندہ بطور سرکاری زبان اپنایا جائے گا۔

اردو کو بطور سرکاری زبان اپنانے کے فیصلے پر عملدرآمد اس اعتبار سے ایک مشکل فیصلہ تھا کہ نہ صرف یہ، کہ قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں ایک طویل عرصے تک تمام تر امور حکومت انگریزوں کے بنائے ہوئے انتظامی ڈھانچے اور زبان میں سرانجام دیے جاتے تھے بلکہ اس امر سے بھی قطع نظر ممکن نہیں کہ اردو پاکستان میں صرف آٹھ فی صد لوگوں کی مادری زبان ہے اور گو کہ اسے پاکستان کی واحد Lingua Franca کا درجہ حاصل ہے تاہم دنیا کے بیشتر ممالک کی سرکاری زبانیں یا تو وہاں کی بیشتر آبادی کی بولی جانے والی زبانیں ہیں یا وہاں انگریزی زبان کو یہ حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں جہاں آئین کے مطابق کوئی قومی زبان موجود نہیں پارلیمانی کارروائی، عدالت، اور مرکز اور ریاستی حکومتوں کے مابین رابطے جیسے سرکاری مقاصد کے لیے ہندی (جو مختلف لہجوں اور بولیوں میں
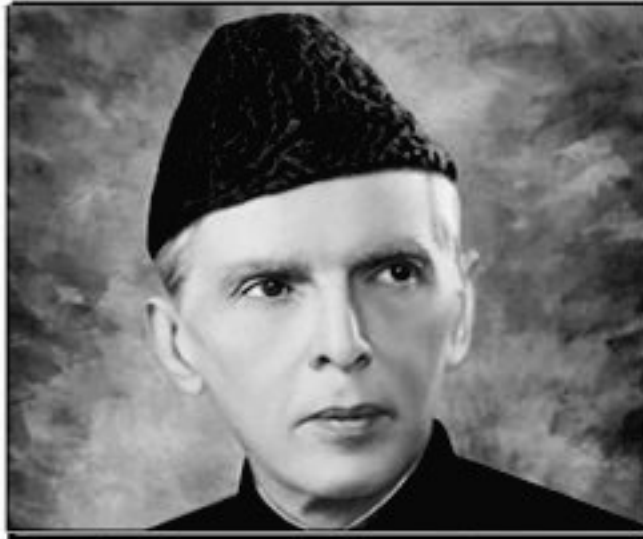
بھارت کے پینتالیس فی صد لوگوں کی زبان ہے) اور انگریزی دونوں کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے جبکہ تمام ریاستوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ قانون سازی کے بعد مقامی زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دے سکتی ہیں اور اس حوالے سے آئین میں واضح گنجائش بھی موجود ہے۔

مذکورہ حوالے سے بھارت میں ۲۲ تسلیم شدہ سرکاری زبانیں ہیں۔ پاکستان کے آئین کی طرح بھارت کے ۱۹۵۰ء کے آئین کے تحت بھی انگریزی کی جگہ مکمل طور پر ہندی کے نفاذ کے لیے پندرہ سال کا عرصہ مقرر کیا گیا تاہم پارلیمنٹ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہے تو اس کے برعکس فیصلہ کر سکتی ہے۔ لیکن ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء کو ۱۵ سال کی یہ مدت ختم ہونے کے بعد بھی حکومت کو ہندی نہ بولنے والی آبادی کی جانب سے اس قدر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کہ انہیں ۱۹۶۳ء میں "آفیشل لینگویج ایکٹ ۱۹۶۳" کا نفاذ کرنا پڑا جس کے تحت انگریزی کے غیر معینہ مدت تک بطور سرکاری زبان استعمال کی اجازت دے دی گئی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں پارلیمنٹ (کی کارروائی) کی زبان اور قانون کی زبان میں تفریق موجود ہے۔ سپریم کورٹ، ہائی کورٹ اور اعلیٰ عدالتوں کی تمام تر کارروائی اور قوانین کی تشکیل انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک اور پڑوسی ملک کے اس لسانی تناظر میں سپریم کورٹ کی جانب سے اردو کو سرکاری زبان قرار دیے جانے کا فیصلہ یقیناً ایک بڑا فیصلہ تھا جس پر عملدرآمد کے لیے محنت اور لگن درکار ہوگی۔

ب۔ اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کے حوالے سے ترجمہ کے ضروری امور، مسائل

ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنی کتاب "تحقیق کا فن" میں معروف سکالر ڈاکٹر مظفر حسن ملک کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی زبان سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں "پار لے جانا" اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں۔ یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے۔ اردو زبان میں ترجمہ کا لفظ جس کا رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے، عربی زبان سے آیا ہے"۔

"پار اتارنے" کے اس عمل کے حوالے سے، دنیا

ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) نے اردو میں دفتری امور کی انجام دہی کے لیے سرکاری مراسلت، اصطلاحات، لغات اور دیگر حوالوں سے بہت سا بنیادی کام مکمل کر رکھا ہے۔ جس سے مستقبل میں روزمرہ کی مراسلت اردو زبان میں سرانجام دینے میں یقیناً معاونت حاصل ہوگی

عالمی زبانوں میں اردو کا مقام

آخری قسط

ڈاکٹر ایم۔ سلطانہ بخش

یہ تو تھا مختصر جائزہ صرف دو کتب خانوں کے ذخائر کا۔ اسی طرح بے شمار قلمی نسخے اور مطبوعہ کتب سینکڑوں کی تعداد میں غیر ملکی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اردو کی ادبی و علمی کتب کا سب سے بڑا ذخیرہ بھارت کے ۳۳ کتب خانوں کی زینت ہے۔ جن میں انتہائی مفید اور معلوماتی خزینے جمع ہیں۔ ان ممالک کے علاوہ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے کتب خانوں میں اردو زبان و ادب کے ذخیرے محفوظ ہیں۔ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کا کتب خانہ اہم ہے۔ ہمارے علوم و فنون کا سب سے بڑا ذخیرہ تو لائبریری آف کانگریس میں مل جاتا ہے۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں مستشرقین کی علمی خدمات کو تاریخ ادبیات میں ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو زبان و ادب پر مستشرقین نے بے شمار کام کیا ہے۔ ان مصنفین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان میں لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، پرتگالی، ڈچ، جرمن اور انگریزی وغیرہ جنھوں نے اردو سے متعلق لغت، قواعد، صرف و نحو، مستشرقین اردو اور مذہبی امور پر کتابیں، رسالے اور کتابچے تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ ان کے کارناموں کا ذکر ہمارے اہل قلم کی متعدد تصنیفات میں ملتا ہے۔

اردو چونکہ بین المسلکتی اور بین الاقوامی مزاج رکھتی ہے اس لیے نہ وہ مغرب کے لیے اجنبی ہے نہ مشرق کے لیے۔ یورپ کے لوگ کئی صدیوں سے اس زبان سے واقف ہیں اور انھوں نے اس زبان میں گراں قدر علمی و ادبی کارنامے بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ اردو سے اہل مغرب کی دلچسپی کا اندازہ محترمہ شبانہ محمود لندن کی کتابیاتی فہارس Urdu Language and literature, a bibilography Sources in Europian languages سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۲ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔ اس وضاحتی فہرست کی خوبی یہ ہے کہ محترمہ شبانہ محمود نے اردو زبان و ادب کے موضوع سے متعلق تمام معلومہ مواد کو، جن کا یورپی زبانوں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی اور روسی میں ترجمہ کیا گیا یا مرتب کیا گیا یا لکھا گیا، نہایت

> اردو زبان اپنی لسانی افادیت کے علاوہ اپنے اندر ایک تہذیبی اور ثقافتی پہلو بھی رکھتی ہے

ماہرانہ انداز میں محتاط طریقے سے یکجا کیا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً ساڑھے تین ہزار کتب یا مضامین کے اندراجات ہیں۔ کتاب کے آغاز میں نامور مستشرق رالف رسل کا پیش لفظ ہے۔

اس وضاحتی فہرست میں حوالہ جاتی کتب اور کیٹلاگ کے موضوع سے متعلق ۸۸، لغات ۱۷۲، تکنیکی اور ادبی اصطلاحات پر مبنی ۹۸ لغات اور فرہنگوں کا تفصیلی اندراج ہے۔ قواعد کی تقریباً ۸۲ کتب، تاریخ زبان سے متعلق تقریباً ۳۲ کتب اور مضامین، درسی و مطالعاتی کتب و مضامین کے ۳۱۱ اندراج ہیں۔ اردو تاریخ و تنقید کے موضوع پر ۱۹۵، خواتین کے گوشے سے ۲۹، اور اردو شاعری سے متعلق تقریباً ۱۳۳ شعرائے کرام کی نظموں، غزلوں اور مثنویوں کے تراجم اور ان پر مطالعے کی کتب کی طویل فہرست درج ذیل ہے۔ ان میں شعرائے متقدمین، متاخرین اور دور جدید کے شعراء میں مجید امجد، افتخار عارف، احمد فراز، وزیر آغا، امجد اسلام امجد اور بے شمار شعراء شامل ہیں۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب، اقبال اور فیض پر بین الاقوامی سطح پر بے شمار کام کیا گیا ہے۔ اردو نثر سے متعلق ۱۴۰ نثر نگاروں کی تخلیقات کے تراجم اور مطالعوں کی فہرست ہے جن میں سب سے زیادہ پریم چند، منٹو اور انتظار حسین کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب بین الاقوامی سطح پر کس قدر مقبول اور معروف ہے۔ یورپ کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو زبان و ادب کے تراجم پر مختلف زبانوں میں کام ہو رہا ہے۔ مثلاً چیکو سلواکیہ میں اردو سے چیک زبان میں، روس اور اس کی آزاد ریاستوں میں ازبک اور روسی زبان میں، اردو سے جاپانی زبان میں، اردو سے ڈچ میں، اردو سے فارسی میں، جاپانی زبان میں، بنگلہ زبان میں، ترکی زبان میں، نیروبی میں اردو سے کو کی زبان میں، مصر میں اردو سے عربی میں اور امریکہ کی کئی ریاستوں میں اردو زبان و ادب کی تخلیقات کے تراجم ہو رہے ہیں اور کچھ ممالک میں تو اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کام بھی ہو رہا ہے اور کئی ممالک میں اردو قواعد اور نصاب پر کتب بھی لکھی جا رہی ہیں۔ بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں اردو فوجیوں

سیاحوں، زائروں اور مسافروں کی مشکلات دور کرنے میں معاون ہے۔

اسی طرح اردو میں بھی کئی زبانوں کی تخلیقات کے تراجم ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ لیکن اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ غیر زبانوں کے تکنیکی، سائنسی اور علمی و فنی کتب و مضامین کو زیادہ اردو کے قالب میں ڈھالا جائے تاکہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔

عصر حاضر میں مختلف ملکوں کی زبانوں اور ان کے ادبی خزانوں تک رسائی آسانی سے ممکن ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے ذریعے مختلف علاقوں کے رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے مزید قریب آسکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ادبی و علمی سرمائے کو سمجھ کر تہذیبی حوالوں سے ایک دوسرے کی شناخت میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔

اردو زبان میں عام طور پر استعمال ہونے والے لفظوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے

اردو زبان کی علاقائی وسعت اور حلقۂ اثر کے سلسلے میں آج صورت حال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے، سمجھنے اور اس زبان میں درس و تدریس اور تعلیم و تحقیق کرنے والے موجود نہ ہوں۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔

لندن میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔ لندن اردو کی کتابوں کی نشر و اشاعت کا مرکز بھی ہے۔ یونیورسٹی کالج آف لندن، اڈنبرا، آکسفورڈ اور کیمرج یونیورسٹی اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ ان اداروں میں اعلیٰ سطح کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام بھی ہے اور کئی یونیورسٹیاں اردو زبان و ادب میں ... ایم اے ... کی ڈگریاں عطا کرتی ہیں۔

اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن کے ادارے میں نامور سکالر رالف رسل اور ڈاکٹر میتھیوز جیسے مستشرق اردو کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں خود اس ملک کے اساتذہ اور ان کے ساتھ بعض اردو سند کار بھی موجود ہیں۔ لندن میں تقریباً ساٹھ سکولوں میں اردو پڑھانے کا باقاعدہ انتظام ہے۔ بریڈفورڈ سمیت پورے انگلستان میں اردو زبان کی تدریس بحیثیت قومی نصاب کے مضمون کی ہو رہی ہے۔

امریکہ میں بھی اردو کی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا گیا ہے اور بہت سے مراکز قائم ہیں۔ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے جن میں برکلے یونیورسٹی، وسکانسن یونیورسٹی شکاگو، ڈیوک، مشی گن، لارنس، ہارورڈ، کولمبیا اور انٹرنیشنل یونیورسٹی کیلی فورنیا اہم ہیں۔ کولمبیا اور برکلے یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب پر کتابوں کا وافر ذخیرہ ہے۔ برکلے یونیورسٹی میں لسانی تجربہ گاہ ہے جس میں اردو کے علاوہ دیگر ایشیائی زبانوں پر کام ہو رہا ہے۔

کینیڈا میں میکگل یونیورسٹی سے اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام شائع ہوئے۔ اس یونیورسٹی میں گریجویشن تک اردو پڑھائی جاتی ہے۔ کینیڈا کے بعض سکولوں میں اردو کی پڑھائی ایک خاص انداز سے ہو رہی ہے، جس سے بچوں کو سوشلائیزیشن میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیشنل نیٹ ورک فار پروموشن آف اردو کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے جس کا بنیادی مقصد اردو کی اہمیت کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنا ہے۔

چیکوسلواکیہ میں پراگ کے مقام پر چارلس یونیورسٹی میں اردو پڑھائی جارہی ہے۔ برما کے مختلف حصوں میں پندرہ سو سے زائد مدارس ہیں جن میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم بھی دی جارہی ہے۔ نیپال کے مسلمان آبادی والے علاقوں میں دینی مدارس کی بڑی تعداد موجود ہے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اس کے علاوہ ہر گاؤں میں ایک مکتب بھی قائم ہے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ کھٹمنڈو کی تری بھون یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم ہے۔ سارک تنظیم کے قیام سے یہاں اردو کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

عرب امارات میں سات سکول ہیں جن میں سے تین میں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ باقی چار انگریزی میڈیم سکولوں میں اردو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔ اس وقت عرب امارات میں رابطہ کی ایک اہم زبان کی حیثیت سے اردو کو قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔

سعودی عرب میں ریاض، جدہ، طائف اور الخبر میں پاکستان سکول اور کالج ہیں۔ یوں تو سعودی عرب کی سرکاری زبان عربی ہے لیکن بولی اور سمجھی جانے والی زبان عربی کے بعد اردو ہے۔ اس لیے یہاں اور عرب امارات میں پاکستان اور بھارت کے باشندوں کی بڑی تعداد بسلسلہ ملازمت یہاں مقیم ہے۔ جن کی رابطہ کی اہم زبان صرف اردو ہے۔ اس وقت ایران کی دو جامعات دانش گاہ تہران اور دانش گاہ طباطبائی تہران میں اردو تدریس کا انتظام ہے۔ جاپان کی دو یونیورسٹیوں اساکا اور ٹوکیو یونیورسٹی کے فارن اسٹڈیز میں اردو

کسی زبان کی ترقی کا انحصار اس کی الفاظ سازی کی اہلیت اور انہیں برتنے کی قوت پر ہوتا ہے

کا شعبہ کام کر رہا ہے۔

چین میں ۱۹۵۴ء میں جامعہ بیجنگ میں مشرقی زبانوں کے شعبے میں شعبہ اردو کا اجراء ہوا۔ اور اردو میں چار سالہ ڈگری کورس کی بنیاد رکھی گئی بیجنگ یونیورسٹی کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کا

اردو عالمی سطح پر محبت کی سفیر ہے

اشاعت گھر اور چین باتصویر میں اردو کے فروغ و اشاعت، ترجمہ اور تحقیق کا کام جس عمدہ اور قابل تحسین طریقے پر اور باقاعدگی سے ہورہا ہے اس کی تفصیل وقت طلب ہے۔ بیجنگ یونیورسٹی چین کی سب سے بڑی اور قدیم ترین درس گاہ ہے۔

روس میں ماسکو یونیورسٹی، لینن گراڈ یونیورسٹی اور تاشقند میں اردو کی تعلیم و تدریس کے علاوہ اردو زبان وادب پر تحقیقی کام ہورہا ہے۔

جرمنی میں اردو کی جُز وقتی لیکچر شپ کئی یونیورسٹیوں مثلاً ہمبرگ، بون، گوٹنگن، میونخ اور مائز میں موجود ہے۔ مگر صرف ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اردو کی کل وقتی لیکچر شپ ایک لمبے عرصے سے قائم ہے۔ ہالینڈ کی ڈان یونیورسٹی اور ایمسٹرڈیم یونیورسٹی میں اردو ایک اضافی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔

ناروے میں اوسلو یونیورسٹی میں ایک شعبہ مشرقی علوم کا ہے اس میں اردو شامل ہے۔

جنوبی افریقہ میں جوہنز برگ کی ڈربن یونیورسٹی میں بی ۔ اے تک اردو بطور ایک اختیاری مضمون کے پڑھائی جارہی ہے۔ صومالیہ میں مقدیشو میں ایک پاکستانی سکول موجود ہے۔

مصر کی جامعہ الازہر اور قاہرہ یونیورسٹی کے مکتبہ الادب میں اردو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

آسٹریلیا میں بھی اردو زبان کی تدریس کی منصوبہ بندی ہورہی ہے۔

مارشس کی آبادی میں اردو وسیع طور پر سمجھی جاتی ہے۔ اردو زبان متعدد مدرسوں، پرائمری اور سکینڈری سکولوں میں پڑھائی جارہی ہے۔ اردو کی تدریس کے لیے حکومت کی طرف سے ۳۵۰ اساتذہ کو تربیت دے کر سکولوں میں تعینات کیا گیا ہے۔

بنگلہ دیش کی صرف دو یونیورسٹیوں یعنی ڈھاکہ یونیورسٹی اور راج شاہی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم ہے۔ غرض یہ کہ اردو زبان اپنے فکری سرمائے کے ممتاز حصے میں انفرادی نشوونما اور قومی یک جہتی کی ترجمان ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی انسان دوستی کی نقیب بھی ہے۔

دنیا کے بے شمار ملکوں میں اردو زبان کی درس و تدریس کے علاوہ ان ملکوں میں ادبی اور ثقافتی انجمنیں اور اور سوسائٹیاں قائم ہیں جن کے زیر اہتمام متعدد رسالے اور اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام بین الاقوامی کانفرنس اور مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ یہ ادارے اردو زبان و ادب کے فروغ میں بڑی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

کسی زبان کی ترویج و اشاعت کا اندازہ یہ معلوم کر کے کیا جاسکتا ہے کہ اس زبان میں کون کون سے اخبار اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ یہ محض ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے زبان کے فروغ میں بے حد مدد ملتی ہے۔ بھارت کے پریس رجسٹرار کی رپورٹ ۱۹۷۱ کے مطابق اردو روزناموں کی تعداد ۳۰۵، سہ روزہ ۱۸، ہفتہ وار اور ماہانہ رسالوں کی تعداد ۱۵۶۱ ہے۔ اردو زبان

> **کسی زبان کے عروج وزوال کی داستان کو دراصل کسی قوم کے عروج وزوال کی تاریخ سمجھنا چاہیے**

بھارت میں اب بھی مقبول ترین زبان ہے۔ یہ کم و بیش ۴۶،۲ ملین لوگوں کی مادری زبان ہے۔

لندن سے پانچ روزنامے اخبار وطن، ملاپ، راوی، آواز حق اور جمہور شائع ہوتے ہیں جب کہ ۹ ماہ نامے اذان، دعوت حق، قرنٹ، خیبر، نسیم انٹرنیشنل، روحانی ڈائجسٹ، سویرا، شفق، صراط مستقیم، دو ماہی جریدے حیات نو اور جدوجہد اور تین سہ ماہی رسالے گھرانہ، پیکار اور اردو ادب شائع ہورہے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد ادبی ادارے اور انجمنیں اردو زبان و ادب کے فروغ میں کوشاں ہیں۔

ایران کے معروف روزنامے کیہان انٹرنیشنل کا اردو ایڈیشن، جدہ سے اردو اخبار المدینہ، کویت کا روزنامے عرب ٹائمز، بنگلہ دیش سے چھ روزنامے، ضمیمے اور خبرنامے اور ۳۵ رسالے ماہانہ و سہ ماہی شائع ہورہے ہیں۔

ماریشیش میں اردو کی ترویج کے لیے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ اس کے علاوہ مقامی ٹیلی وژن پر اردو فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ نیز ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام مشاعرے اور عالمی کانفرنس بھی منعقد کی جاتی ہے۔

امریکہ میں اردو کی ترویج کے لیے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ اس کے علاوہ مقامی ٹیلی وژن پر اردو ٹیلی فون لائنز چھ سال سے کام کررہی ہے۔ اس پر چوبیس گھنٹے اردو میں پاک بھارت کی خبریں دی جاتی ہیں۔ پانچ ہزار سے زائد خبریں ہوتی ہیں۔ جنھیں دس لاکھ سامعین سن سکتے ہیں۔ اردو کی خدمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

اسی طرح ٹوکیو میں ایک اردو کمپوٹر تیار کیا گیا ہے، جس کے ذریعے اردو کے بعض ڈراموں اور فلموں وغیرہ کو سیناریو کی صورت میں منتقل کیا جاتا ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کی سالانہ تقریب کے موقع پر بعض اردو ڈرامے سٹیج کیے جاتے ہیں۔ ڈرامہ انار کلی کئی بار سٹیج ہوا ہے۔

دنیا بھر میں اردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کے حلقہ اثر کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پندرہ سے زائد بڑے ملکوں کے عالمی نشریاتی ادارے اردو زبان میں خصوصی پروگرام نشر کررہے ہیں۔ برصغیر سے باہر اردو

زبان کی ترویج و ترقی میں ریڈیائی نشریات اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ان کا دورانیہ دیکھئے۔ بی بی سی اور ایسٹرن سروس روزانہ تین مجالس میں اردو پروگرام نشر کرتی ہے، تقریباً ۹ گھنٹے دس منٹ چین کا ریڈیو بیجنگ، روزانہ آدھ گھنٹے، وائس آف امریکہ، صبح آدھ گھنٹہ اور شام ایک گھنٹہ، ہفتے میں کل ساڑھے دس گھنٹے، وائس آف جرمنی سے پنتالیس منٹ دورانیے کی اردو سروس، ہفتے میں ساڑھے تین گھنٹے، ریڈیو تاشقند ہفتے میں سات گھنٹے، ایران سے ریڈیو تہران اور زاہدان ایک گھنٹہ روزانہ، کویت ریڈیو سے دو گھنٹے اردو نشریات، ریڈیو قطر سے دو گھنٹے اردو نشریات، متحدہ عرب امارات کے ابوظہبی، ام القوین اور راس الخیمہ سے روزانہ ۹ گھنٹے کی اردو نشریات، آل انڈیا ریڈیو روزانہ تین مجلسوں میں ۱۲ گھنٹے کی نشریات، ریڈیو ماسکو ہفتے میں ۲۱ گھنٹے، ڈنمارک ریڈیو روزانہ آدھ گھنٹہ، ماریشیس ریڈیو ایک گھنٹہ اردو نشریات اور ٹی وی پر ہر ہفتے ایک ایک دن سوا گھنٹے اردو پروگرام، آسٹریلیا ریڈیو جمعہ کو آدھ گھنٹہ اردو نشریات پیش کر رہا ہے۔ ان کے علاوہ ریڈیو بغداد، این ۔ ایچ ۔ کے جاپان، ریڈیو قاہرہ، نیپال ریڈیو، جنوبی افریقہ میں ڈربن اور شاگو ریڈیو بھی اردو نشریات میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کی عالمی سروس، بارہ گھنٹے کی نشریات پیش کر رہا ہے جو چونسٹھ ممالک کے سامعین کے لیے ہے۔

اردو زبان کے وسیع حلقۂ اثر کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو عالمی سطح پر محبت کی سفیر ہے۔ یہ مختلف ذہنی دھاروں سے تعلق رکھنے

اردو زبان اپنی ساخت میں بین الاقوامی مزاج رکھتی ہے

والے مختلف عقائد سے وابستہ، مختلف مزاجوں کے حامل بڑے گروپوں کی تخلیقی و تصنیفی زبان ہے اور [illegible] تعداد ممالک میں وہاں

کی گلیوں، کوچوں، بازاروں اور گھروں میں اپنی زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ ان تمام میں اردو کی روایت، مشترک ذریعہ اظہار کے طور پر اس کے چلن، تہذیبی و ادبی سطح پر اس کی اہمیت اور صورت حال کے جائزے سے یہ واضح ہے کہ اردو زبان کس طرح پاکستانی قوم کی مشترک سوچ، مشترک تہذیبی قدر اور ثقافتی سرگرمیوں کو مقبول بنانے میں اپنا موثر کردار ادا کر رہی ہے اور عالمی سطح پر اپنے حلقۂ اثر میں وسعت پیدا کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماریشیس کی عالمی اردو کانفرنس

> زندہ زبان کے لیے ضروری ہے کہ دوسری زبانوں سے اس کا ربط و ضبط بڑھتا رہے اور ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ اور ترجمے کی راہیں کشادہ ہوتی رہیں

۱۹۹۳ء میں بھارت کے سکالر ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "اردو زبان کو بھی یونسکو کی ایک زبان تسلیم کیا جائے۔ کیوں کہ اس وقت دنیا میں تقریباً اسی (۸۰) کروڑ افراد یہ زبان سمجھتے اور بولتے ہیں اور یہ دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ لہذا اقوام متحدہ کی کارروائیوں میں اردو تراجم کا اہتمام کیا جائے۔

عالمی زبانوں میں اردو کے مقام کے سلسلے میں یہ جائزہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہمیں اردو کا مستقبل صاف نظر آرہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی کھل کر سامنے آتا ہے کہ دیار فرنگ میں اردو زبان میں جس دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے وہ کس حد تک ہماری کاوش کا ثمر ہے؟ اور اسے فروغ دینے اور عالمی سطح پر اس کی اہمیت تسلیم کروانے کے لیے ہم کیا جتن کر رہے ہیں؟

اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ایک جامع زبان ہے۔ یہ بین الاقوامی مزاج کی حامل ہے۔ اس کے دامن میں وسعت ہے اور اس کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کی صورت حال تسلی بخش ہے۔ تاہم اردو زبان کے تحفظ اور عالمی سطح پر اس کی اہمیت کو تسلیم کروانے کے لیے ہمیں چند نکات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور ان کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا جانا چاہیے۔

اول تو یہ کہ اردو کے علمی ذخیرے میں بے حد اضافہ کیا جائے۔ غیر ملکی زبانوں کے سائنسی علوم و فنون کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

دوم اردو کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہونی چاہیے تاکہ عالمی سطح پر اس کی اہمیت واضح ہوسکے۔ کوئی بھی زبان اپنے بولنے والوں ہی کی بناء پر زندہ رہتی ہے۔ دیگر قومیں خواہ اس زبان کو کتنا ہی استعمال کریں وہ اسے ہر گز اتنا فروغ نہیں دے سکتی، جس کی وہ مقدار ہوتی ہے۔

اخبار اردو، اسلام آباد
اخبارِ اردو

ماہنامہ اسلام آباد

مقتدرہ قومی زبان

جنوری ۱۹۹۹ء

1999

ڈاکٹر عطش درانی

عظیم کتابوں کے اردو تراجم

دوسری قسط

رابرٹ ہچنز کا اپنا طریق کار تھا۔ ۱۹۵۰ء تک اس نے غور و فکر جاری رکھا۔ مورٹی مور ایڈلر اس کا ساتھی تھا اور بالآخر اس کی تحریک پر اس مقصد کے لیے ۱۹۶۹ء میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے ۵۴ جلدوں پر Great Books کا ایک سیٹ شائع کیا، پہلی جلد میں ہچنز نے بالغ افراد کے لیے دس سالہ نصاب اپنے تعلیمی تصورات "عظیم گفتگو" اور طریق کار شامل کیے۔ دوسری اور تیسری جلد میں باقی تمام جلدوں میں موجود ۴۴۳ کتابوں کے عظیم افکار کو ۱۰۲ عنوانات کے تحت اشاریہ بند کیا گیا ہے۔ جو مزید ۲۹۸۷ ذیلی عنوانات پر منقسم ہیں۔ تیسری جلد میں اضافی مطالعے کے لیے ۱۱۸۱ مصنفین کی ۲۶۰۳ کتابوں پر مشتمل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ باقی اکاون جلدوں میں موجود مصنفین میں ہومر، ایکیلیز، سوفوکلیز، یوری پیڈیز، ارسطو فینیس، ہیروڈوٹس، تھوسی ڈیڈیز، افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس، آرشمیدس، اپالونیس، نیکوماکوس، لیوکریشیس، ایپک ٹیٹس، مارکس آریلیس، ورجل، پلوٹارک، کارنیلیس، بطلیموس، کاپرنیکس، جوہانز کیپلر، فلاطی نوس، سینٹ آگسٹائن، تھامس ایکوئنس، دانتے، چاسر، میکیاولی، ہوبز، رابیلیس، مونٹین، شیکسپیئر، گلبرٹ، گیلیلیو، ہاروے، میگل، فرانسس بیکن، ڈیکارٹ، سپینوزا، ملٹن، پاسکل، نیوٹن، ہیوجنز، لاک، برکلے، ڈیوڈ ہیوم، سوفٹ، سٹرن، فیلڈنگ، مونٹیسکو، روسو، آدم سمتھ، گبن، کانٹ، ہیملٹن، مل، فیراڈے، بوسویل، لواڑے، فوریر، گوئٹے، میلویلی، ڈارون، مارکس، اینگلز، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، ولیم جیمز اور فرائڈ شامل ہیں۔ ان ۵۱ جلدوں میں سے زرد رنگ کی ۱۶ جلدیں ادبیات کے موضوع کا احاطہ کرتی ہیں، نیلے رنگ کی ۱۲ جلدیں عمرانی و سماجی علوم کو محیط ہیں، سبز رنگ کی ۱۰ جلدیں طبعی علوم پیش کرتی ہیں اور سرخ رنگ کی ۱۳ جلدیں فلسفہ و الٰہیات کا احاطہ کرتی ہیں۔

عظیم کتب کی قابل ترجمہ فہرست تیار کی ہے

ہچنز نے جو ۱۰۲ عنوانات قائم کیے، وہ ذیلی طور پر ان کے تصورات، تعریفات، بنیاد، تقابل، امتیاز، احاطہ کار، تنوع، تنظیم و نظم، آغاز و ارتقا، متفرق نظریات و تصورات، استعمال، طریق کار، تعلق، تنقید اور تبصرہ کا احاطہ کرتے ہیں۔ نیا ایڈیشن ۶۰ جلدوں پر مشتمل ہے

۱۹۵۹ء میں یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم انڈیانا کے صدر کیوناف (Cavanaugh) نے مورٹی مور ایڈلر کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور ڈگری پروگرام کا آغاز ہوا۔ چھ سال بعد اس کے پہلے ناظم اوٹو برڈ (Otto Bird) نے جو Great Idea Today (۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۰ء میں اشاعت) کا ایڈیٹر بھی تھا، نوٹرے ڈیم کالج سیمینار کا آغاز کیا جو عظیم کتب کے مطالعہ کے دو سمیسٹر پر مبنی تھا۔ تاہم ایک کیتھولک عیسائی کالج ہونے کی بنا پر سینٹ جان کالج کے برعکس جہاں "فلسفہ" بنیادی موضوع تھا، یہاں "عقائد" کے استحکام پر زور دیا جانے لگا۔ تاہم "تاریخ سائنس"، "تاریخ فنون" اور "تاریخ تعقل" جیسے موضوعات بھی نصاب میں شامل کیے گئے۔ حالیہ برسوں میں مشرق کے کلاسیکی مواد کو بھی شامل مطالعہ کیا گیا ہے۔ آرٹس، ادب اور انجینئرنگ کے ہزاروں طلبہ کوئی تیس کے قریب عظیم کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ماہرین تعلیم کا سوال یہ ہے کہ کیا سینٹ جان کا پروگرام ڈیوی کے سماجی نظریات کا رد عمل ہے یا "ثقافتی بچاؤ" کی تحریک ہے۔ اس کے جواب میں ۱۹۶۷ء میں نیویارک سٹیٹ یونیورسٹی میں ہیرس ووفورڈ (Harris Woffard) نے اولڈ ویسٹ بری میں ایک تجرباتی کالج قائم کیا تاکہ عظیم کتب کے تعلیمی کردار کو آزمایا جا سکے، وہ بنیادی طور پر ہچنز کا حامی تھا اور آزادانہ مطالعے کے فروغ کے لیے کام کرتا رہا۔ ایک اور تجربہ ۱۹۶۰ء

امریکا میں کئی کالجوں کی بنیاد عظیم کتابوں کے مطالعے پر رکھی گئی ہے

ہیں جوزف تسمان نے برکلے میں کیا۔ اس نے میکل جان کے خیالات کو آگے بڑھایا اور اسے "تعلیمی جنت گم گشتہ کا ہیرو" قرار دیا۔ تاہم وہ سابقہ دونوں کالجوں کے "مابعد الطبیعیاتی" نظریات سے اختلاف بھی کرتا تھا۔ اس نے "مسکی طریق تدریس" کو بنیاد بنایا۔ ۱۹۷۰ء میں اسے مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

امریکا میں اسی طرح کے کئی کالج دینیات اور الٰہیات کے مطالعے کے لیے فروغ پاتے رہے لیکن ان کی بنیاد "عظیم کتابوں کے مطالعے" ہی پر رکھی گئی اور اس مطالعے سے "دوامیت پسندی" کی تحریک کو فروغ ملتا رہا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران میں غیر تکنیکی عظیم کتابیں لوگوں کے زیر مطالعہ رہیں۔ اب امریکا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں تکنیکی کتابیں بھی شامل ہونے لگی ہیں اور مباحثی و سوال و جواب طریق کے ساتھ ساتھ لیکچر طریق بھی تدریس کا حصہ بننے لگا ہے۔

نصاب سازی کے بارے میں دوامیت پسندوں کا نظریہ "ابتدائی سطح پر پڑھنے، لکھنے اور گننے کی روایتی مہارتوں کے حصول"، ثانوی سطح پر "زبان، ریاضی، سائنس، تاریخ اور غیر ملکی زبان کی تحصیل کے پانچ مضامین یا میدانوں کی تحصیل" اور اعلیٰ سطح پر "ادب، سماجی و طبعی علوم، فلسفہ اور الٰہیات کے موضوعات پر عظیم افکار کے مطالعے پر" مبنی ہے۔

موڑٹی مور کی تحریک پر ۱۹۴۷-۴۹ء سے نیویارک کوپریونین اور کارنیگی فاؤنڈیشن نے "عظیم کتب" کے لیے رقوم مہیا کرنا شروع کیں۔ ایڈلر ارکسن کے پروگرام میں بھی شریک ہوا تھا اور رابرٹ ہچنز کے پروگرام کا ساتھی بھی رہا چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ عظیم کتب کا مطالعہ طلبہ کے علاوہ بالغوں کی ہر سطح کے لیے بھی مفید ہے اور اسے سکولوں کالجوں کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغاں کے لیے بھی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ ہچنز کے چار سالہ پروگرام میں تو کوئی ۴۷ کتابیں شامل تھیں۔ لیکن تعلیم بالغاں کے پروگرام کے لیے الگ توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ اس موضوع پر بحث جنگ عظیم دوم کے بعد سے شروع ہوئی تھی اور کوئی ۱۷ شہروں میں تین سال تک کوئی ۲۰ ہزار افراد نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۷ء میں عظیم کتب کی فاؤنڈیشن قائم کی گئی، جس کا صدر لین اے ولیمز (Lynn A Williams) تھا۔ ہچنز اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا صدر تھا۔ ۱۹۵۰ء میں اس فاؤنڈیشن نے تعلیم بالغاں کے ہزار گروپوں اور ۱۹۵۵ء میں کوئی ۱۶۰۰ گروپوں کو مباحثہ اجلاسوں میں شریک کیا۔ "ایڈلٹ ایجوکیشن فنڈ" نے انھیں پانچ لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا۔ کوئی دس لاکھ ڈالر کے حصص فروخت ہوئے۔ نتیجۃً ان کا کام بڑھ گیا۔ تعلیم بالغاں کے سب سے بڑے

امریکا جیسے ملکوں میں ایسے منصوبوں کے لیے فاؤنڈیشنیں لاکھوں کے عطیات دیتی ہیں

پروگرام میں حصہ لینے والوں کی تعداد ۷۵ ہزار سے اوپر جاچکی تھی۔ آج بھی یہ تعداد پچاس ہزار سے کسی طور کم نہیں۔ ان مباحثی گروہوں میں تعلیم یافتہ افراد، پیشہ ور افراد، مذہبی، غیر مذہبی، جمہوری اور دیگر ہر قسم کے نظریات میں یقین رکھنے والے بالغ مرد وزن شریک ہوتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں جونیئر پروگرام بھی شروع ہوا۔ ایڈون مولڈوف (Edwin Moldof) اس کا علمی ناظم تھا۔ اس نے پانچویں سے ساتویں جماعت کے طلبہ کے لیے پروگرام شروع کیا۔ چار سو ابتدائی گروپوں کے مباحثے کے لیے ایک سیٹ شائع کیا گیا۔ ۱۹۶۳ء اور پھر ۱۹۶۷ء میں اس سیٹ پر نظر ثانی کی گئی اور اسے نویں جماعت تک بڑھا دیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں ۳۵ ہزار افراد سے سروے کیا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض کتابیں مفید رہیں اور بعض مفید نہیں تھیں۔ اس وقت شائع شدہ جونیئر گریٹ بک سیٹ پہلے سے بہت مختلف ہوچکا ہے۔

"گریٹ بک فاؤنڈیشن" نے اساتذہ کی تربیت کا پروگرام بھی شروع کیا ہے۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۲ء کے دوران میں اس تربیتی پروگرام پر بھی تحقیق کی گئی اور معلوم ہوا کہ لوگ اس تحریک سے نہ صرف مطالعہ کا طریقہ سیکھتے ہیں بلکہ ادب، سیاسیات، تاریخ، سائنس، فلسفہ اور مذہب میں زیادہ گہرے فکر و تعقل کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ آزادانہ سوچ کے حامل بنتے ہیں اور اپنے غور و فکر کا بہتر اظہار کرسکتے ہیں۔

****

عظیم کتب کے مطالعے کا آغاز علمی افق پر ہمیں قدیم مصر، چین اور یونان میں بھی نظر آتا ہے اور پھر اموی دور میں مسلمانوں کے ہاں اس پر باقاعدہ توجہ دی جانے لگی۔ عباسی دور میں عظیم کتب کے تراجم اور مباحث کا ذکر ہم کرچکے ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ "بیت الحکمت" جیسے کتب خانے میں اس وقت کے طلبہ اور اہل علم کو عظیم کتابوں کی نقلیں حاصل کرنے میں اتنی بھی دیر نہیں لگتی تھی، جتنی آج کے مشینی دور میں عکسی نقول حاصل کرنے میں لگتی ہے۔ سینکڑوں کاتب چند لمحوں میں کسی کتاب کے مختلف صفحے باہم تقسیم کرکے مفت کتابت کردیتے تھے۔ کتابیں ترجمہ کرنے والوں کو معاوضہ خلفاء اور امراء کی طرف

دوامیت پسندوں کا نظریہ عظیم افکار کے مطالعے ہی پر مبنی ہے

سے "کتابوں کے وزن کے برابر سونا تول کر دینے" کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ درسی نظاموں میں عظیم مصنفین کی کتابوں کے مطالعے کو نصابی حیثیت حاصل تھی۔ استدادِ زمانے کے ہاتھوں مسلمانوں کے درس نظامی جیسے مکاتب میں بھی علم الکلام، منطق اور فلسفے تک محدود ہوتے چلے جانے کے باوجود، آج بھی ان مضامین ہی میں سہی "عظیم کتب" کے مطالعے کو نصاب کی بنیاد ٹھہرایا جاتا ہے۔

ہچنز چونکہ امریکی اور مغربی مفکر ہے، اس لیے کتابوں کے انتخاب میں بھی اس نے صرف مغربی مصنفین کو ملحوظ رکھا ہے۔ جبکہ ایسے انتخابوں کا آغاز بہت پہلے ہو رہا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں میکس مُلر نے مشرق کی مقدس کتابوں کا انچاس جلدوں پر مشتمل ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ مصر میں قطب شہید نے "ایک ہزار کتابوں کے تراجم" کا ایک منصوبہ شروع کیا تھا۔ بابائے تاریخ سائنس جارج سارٹن نے "مقدمہ تاریخ سائنس" میں قدیم یونانی، چینی، رومی، اسلامی اور قبل از نشاۃ ثانیہ کی یورپی تصانیف کی فہرستیں فراہم کی ہیں۔ ہمارے ہاں ہجرہ کونسل نے سو عظیم اسلامی کتب کے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ سید حسین نصر نے اسلامی سائنس پر ایک مشرح کتابیات Annotated Bibliography of Islamic Science شائع کی ہے جس میں اٹھارویں صدی سے ۱۹۷۰ء تک کی مطبوعہ کتابیں شامل ہیں۔ حال ہی میں جدید سائنسی علوم پر پانچ سو کے قریب مصنفین کی ایک فہرست ڈی سپیرز اور پی ریڈیلٹ ڈی گریو نے رسالہ "Impact of Science in Society" کے شمارہ ۱۶۰ء ۳۴۱، ۳۴۸ء میں شائع کی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے ۱۹۸۹ء تک کی سو عظیم کتابوں کی ایک فہرست جس میں عمرانی علوم، ادبیات اور فنون بھی شامل ہیں، اور جو جدید مغرب پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں، یورپی اور امریکی دانشوروں اور صحافیوں کی ایک جماعت نے سنٹرل اینڈ ایسٹ یورپین پبلشنگ پراجیکٹ لندن سے شائع کی ہے۔ ایسے کئی متفرق کثیر جلدی منصوبے مثلاً Dictionary of Scientific Biography بھی منظر عام پر آتے رہتے ہیں جن میں کتابیاتی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اگر ان سب کو ملا کر دیکھا جائے تو مشرق بعید سے لے کر اسلامی عہد اور مغرب جدید تک، عہد قدیم سے لے

رابرٹ ہچنز کی تحریک پر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے عظیم کتب کا سیٹ تیار کیا

کر ۱۹۹۵ء تک کم و بیش ایک ہزار ایسی کتابوں کی فہرست لازماً ہمارے سامنے آتی ہے جن سے افکار عالیہ کا انتخاب کر کے چند جلدوں میں بطور نصابی ضرورت کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نصابی ضرورت کے پیش نظر اساتذہ، ماہرین تعلیم اور نصاب سازوں کے لیے ان ہزار سے زائد کتابوں کا اردو ترجمہ ہونا ضروری ہے، جن کے مطالعے کے بعد نہ صرف ان کے لیے ترتیب و تدوین نصاب میں آسانی ہو گی بلکہ بیان و اسلوب میں بھی ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

اردو میں عظیم کتب کے تراجم کا خیال بھی کوئی نیا نہیں۔ شمس الامرا (دکن)، جامعہ عثمانیہ (دکن)، دہلی کالج، سرسید کی انجمن مطالب مفیدہ، انجمن پنجاب اور انجمن ترقی اردو جیسے اداروں نے ایسے کئی منصوبے نہ صرف پیش کیے بلکہ سینکڑوں کتابیں بھی ترجمہ کر کے شائع کیں۔ اس کے باوجود علم و دانش کی مورد بالا بحث کی منزل بہت دور ہے۔ سہ ماہی "اردو" جولائی ۱۹۳۸ء کے شمارے میں مولوی عبدالحق نے "غیر زبانوں کی اعلیٰ تصانیف" کی ایک فہرست بھی پیش کی تھی جنھیں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس کا جواز اور اس کے ذریعے سے اردو کی ادبی، علمی، لسانی اور اسلوبیاتی ترقی کی متوقع راہیں بھی بیان کر دیں۔ انھوں نے ۱۵۰ ایسی کتابوں کی فہرست شائع کی، جس میں یونانی، رومی، اطالوی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، سکنڈے نیوین، بلجیئن، ہسپانوی، عربی، روسی، چینی، جاپانی، سنسکرت، پالی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی ادبی کتابیں شامل تھیں۔ اگرچہ انھوں نے زیادہ تر ادبی کتابوں کی فہرست بنائی اور علمی کتابیں دو چار سے زیادہ نہیں لیکن ان کے ترجمے کی اہمیت کے بارے میں ان کے بیان کردہ دلائل غور طلب ہیں۔

جامعہ عثمانیہ میں اگرچہ سوا تین سو کے قریب تراجم شائع ہوئے لیکن زیادہ تر نصابی ضروریات اور تقاضے پیش نظر تھے، چنانچہ عظیم کتب کے بہت کم ترجمے شائع ہوئے۔ دور جدید میں نصابی کتابوں کے تراجم کی اہمیت اس لحاظ سے کم تر ہو چکی ہے کہ اول چونکہ یہ کتابیں معلوماتی انداز کی حامل ہوتی ہیں اور دوم معلومات کا سیلاب روز افزوں ہونے کے باعث چند سال میں بلکہ چھپتے ہی ان کتابوں کے مندرجات پرانے ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے نئے سرے سے کتابوں کی تالیف و تصنیف ہی مفید رہتی ہے۔ لیکن عظیم کتابیں جو علم و دانش اور حق و صداقت کا ابدی خزانہ لیے ہوتی ہیں، ہر دور کا حوالہ بنتی ہیں اور ان کے ترجمے ہوتے رہنا ضروری اور لازمی ہو جاتا ہے۔

اردو میں عظیم کتب کے مطالعے کا خیال کوئی نیا نہیں

اردو میں ایسی کتب کے اکاد کا تراجم پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ کتابیات تراجم از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ میں ایسے کئی تراجم کا سراغ ملتا ہے۔ انجمن ترقیٔ اردو کے کتب خانے میں بھی ایسے بیسیوں تراجم موجود ہیں، شاذ و نادر ہی سہی، کسی نہ کسی اشاعتی ادارے کی طرف سے بھی ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن تعلیمی ضروریات کے لیے کسی جامع منصوبے کے تحت ان تراجم کی اشاعت کا آغاز ابھی تک کسی ادارے نے نہیں کیا۔ جامعہ عثمانیہ میں بعض اسلامی عظیم کتب کے صرف عربی، فارسی متن شائع کیے گئے۔ پاکستان کی ہجرہ کونسل سو ایسی کتابوں کی ایک بنیادی فہرست مرتب کرکے اور دس بارہ کتابیں (انگریزی میں) شائع کرکے ختم ہو گئی۔ ادارہ تحقیقات اسلامی اور ایسے دیگر علمی اداروں کی طرف سے کبھی کبھار کوئی اردو ترجمہ سامنے آجاتا ہے۔ لیکن نئی نسلوں کے ذہنوں کی آبیاری غیر رسمی کی بجائے رسمی اور تعلیمی حوالے سے کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے رابرٹ ہچنز کے Great Books کی اشاریہ جاتی جلدوں سے افکار عالیہ منتخب کرکے شائع کرنا شروع کیے لیکن ایک کتابچے سے آگے نہ بڑھ سکے۔

مقتدرہ قومی زبان میں اس کے آغاز (۱۹۷۹ء) کے ساتھ ہی "امہات الکتب کے تراجم" کی داغ بیل ڈالی گئی۔ آغاز میں وہی "نصابی کتابوں کے تراجم" کا نقطۂ نظر سامنے رہا۔ ۱۹۸۳ء تک اس کی مجلسِ ترجمہ ایسی ہی کتابوں کی فہرستیں مرتب کرتی رہی۔ جو ایم اے، ایم ایس سی کی سطح تک کارآمد ہوں۔ ۵۔ مئی ۱۹۸۴ء کو مقتدرہ نے اس بنیادی امر کی طرف توجہ دیتے ہوئے ایک ذیلی کمیٹی کا اجلاس کیا، جس نے عالمی کلاسیکی کتابوں کے ترجمے کی سفارش کی۔ لیکن دو چار ادبی کتابوں کے نام دینے کے بعد یہ مجلس بھی ختم ہو گئی۔ ۱۹۸۹ء میں مذکورہ بالا ماخذوں سے منتخب کردہ تین سو کتابوں کی ایک فہرست مقتدرہ کے دارالترجمہ میں مرتب کی گئی اور اس کو بطور منصوبہ سامنے لانے پر غور و خوض کا آغاز ہوا۔ ۱۹۹۰ء کی ہیئت حاکمہ نے اس منصوبے کو تفصیلات کے ساتھ پیش کرنے کی منظوری دی تاکہ ان کے ترجمے سے علم و دانش کا یہ ذخیرہ نہ صرف اردو میں مہیا ہو سکے بلکہ اردو زبان میں ادائیگی اور اسلوب کے نئے سانچے بھی میسر آسکیں اور تعلیمی میدان میں خاطر خواہ

> **عظیم کتب کا مطالعہ ثقافت کو پروان چڑھانے کا بڑا ذریعہ ہے**

"مواد مطالعہ" بھی میسر ہو سکے جو مقتدرہ کی قرار داد کے نکات میں سے ایک ہے۔

یہ معاملہ زیر غور ہی رہا حتی کہ ۱۹۹۵ء میں حکومت کی اس خواہش پر کہ ۱۹۹۷ء میں پاکستان کے پچاس سالہ جشن آزادی کے موقع پر ہر ادارہ ایسا کوئی پروگرام پیش کرے، مقتدرہ نے بھی پچاس ترجیحی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی۔ ۲۳ مئی ۱۹۹۵ء کو مقتدرہ کے قومی سیمینار میں ان پچاس تراجم کے لیے حکومت سے سفارش کی گئی کہ اس مقصد کے لیے مقتدرہ کو وسائل مہیا کیے جائیں۔ "اخبار اردو" اور مراسلت کے ذریعے سو کے قریب اہلِ علم سے فہرست سازی میں تعاون کے لیے تجاویز بھی مانگی گئیں۔ ان کی روشنی میں تین سو کتب کی اس فہرست پر بھی نظرثانی کی گئی۔ تاکہ ان کے لیے وسائل حاصل کیے جائیں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر کہیں سے بھی وسائل مہیا نہ ہوئے تو مقتدرہ کم از کم دس کتب کے اردو ترجمے شائع کرنے سے اس کام کا آغاز کر دے گا جو مندرجہ ذیل موضوعات کو محیط ہوں گے:

۱۔ فلسفہ و الہیات
۲۔ کلاسیکی عمرانی و طبعی علوم
۳۔ جدید عمرانی و طبعی علوم

۲۷ ستمبر ۱۹۹۵ء کو مقتدرہ کی ہیئت حاکمہ نے اس منصوبے کو شروع کرنے کی باقاعدہ منظوری دی۔ قومی کمیشن برائے تاریخ و ثقافت کے اجلاس منعقدہ یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء میں بھی فیصلہ ہوا کہ مقتدرہ پچاس کتب کے تراجم ضرور شائع کرے۔

ان عظیم کتب کے انتخاب کے سلسلے میں پاکستانی یونیورسٹیوں مثلاً پنجاب یونیورسٹی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، بلوچستان یونیورسٹی، قومی سائنس یونیورسٹی کے علاوہ اردو سائنس بورڈ، اقبال اکادمی، قومی ادارہ برائے تاریخ و ثقافت، اکادمی ادبیات، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز جیسے سرکاری علمی اداروں کے ساتھ ساتھ ہمدرد یونیورسٹی کراچی، مشعل پاکستان لاہور اور پائیڈ لاہور جیسے متعدد نجی اداروں کو بھی لکھا گیا کہ وہ مختلف علوم کی اہم کتابوں کی نشاندہی فرما دیں۔ ان کے علاوہ ملک کے سو سے زائد صاحبانِ علم سے بھی گزارش کی گئی کہ وہ انتخاب کے ضمن میں رہنمائی فرمائیں۔ ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد "تجاویز" کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کر لی گئی جو مجوزہ پچاس کتب کی فہرست کے ہمراہ ایک بار پھر جناب افتخار عارف صدر نشین مقتدرہ نے اہلِ علم

تعلیمی ضروریات کے لیے جامع منصوبے کے تحت ترجمے کا آغاز کسی نے نہیں کیا

کی خدمت میں ارسال کی تاکہ وہ ان میں سے دس ترجیحی کتب کی نشاندہی فرما دیں اور ان کے جوابات سے بالآخر ایک "ترجیحی فہرست" مرتب کر لی گئی۔ اس فہرست سازی میں مدد دینے کے لیے جناب فخر زمان (اکادمی ادبیات)، جناب شریف کنجاہی، جناب ظفر اقبال (اردو سائنس بورڈ لاہور)، جناب سجاد حیدر، جناب نیاز عرفان (تعمیر ملت فاؤنڈیشن اسلام آباد)، ڈاکٹر این اے بلوچ، ڈاکٹر مظفر حسن ملک، جناب حمید نسیم، کرنل غلام سرور، جناب جاوید اقبال سید (وائس چانسلر اوپن یونیورسٹی)، جناب خالد امین، ڈاکٹر جمیل جالبی (سابق صدر نشین مقتدرہ)، جنرل شجاعت حسین (وائس چانسلر سائنسی و تکنیکی یونیورسٹی)، جناب مسعود اشعر (مشعل پاکستان)، قاضی قیصر الاسلام، جناب ریاست حسین (قومی ادارہ برائے السنہ جدیدہ اسلام آباد)، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی (اقبال اکادمی لاہور)، ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی (جامعہ بہاء الدین زکریا ملتان)، شوکت صدیقی، حکیم محمد سعید (ہمدرد یونیورسٹی کراچی)، جناب عنایت اللہ (پائیڈ لاہور)، جناب احمد ارسلان (قائد اعظم یونیورسٹی)، میاں معظم شاہ برائے مس ناہید خان، جناب خورشید احمد خان (بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان)، جناب نذیر احمد (قومی مرکز دستاویزات)، ڈاکٹر انعام الحق کوثر اور جناب وزیر آغا نے مدد دی۔ ان کے علاوہ جناب میرزا ادیب، ڈاکٹر تحسین فراقی (لاہور)، جناب صادق حسین طارق، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف، (ادارہ تاریخ و ثقافت اسلام آباد)، جناب غلام مصطفیٰ قاسمی (شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد)، جناب افضل احسن رندھاوا، اور جناب محمد ابراہیم جویو نے اپنے طور پر مفصل فہرستیں بھی اس بنیادی فہرست کی تیاری کے لیے مہیا فرمائیں۔

ان تمام ماخذوں سے حاصل کردہ فہرست میں اردو میں قابل ترجمہ عظیم کتابوں کی فہرست بھی ہزار سے زائد ہو جاتی ہے۔ اگر ایک سخت کڑا انتخاب بھی کیا جائے تو یہ تعداد تین سو سے زائد ہی ٹھہرتی ہے۔ صرف پچاس علمی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کا تخمینہ لاکھوں نہیں، کروڑوں کو پہنچتا ہے۔ تین سو سے زائد کتب کے ترجمے اور اشاعت کا کام بھی صرف سرکاری وسائل ہی سے انجام نہیں دیا جا سکتا۔ یقیناً نجی وسائل اور انفرادی کوششیں مل جل کر ہی ایسے کاموں کو انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔ امریکا جیسے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں صاحبان وسائل کی فاؤنڈیشنیں ایسے کاموں کا بیڑا

> **درس نظامی میں بھی عظیم کتاب کے مطالعے کو نصاب کی بنیاد بنایا جاتا ہے**

اٹھاتی ہیں اور پھر ان کی اشاعت، مطالعے اور خرید کا ایک وسیع حلقہ بھی موجود ہوتا ہے۔ جب کہ ملک عزیز میں ابھی یہ سوچا جا رہا ہے کہ اگر پچاس اردو تراجم بھی پانچ سو ہزار کی تعداد میں شائع ہو جائیں تو غنیمت ہیں۔

****

اہل مغرب کے عظیم مصنفین کے کلاسیکی دور کے ناموں کا تذکرہ "Great Books" کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ اسلامی عہد کے کلاسیکی مصنفین میں سے ہجرہ کونسل نے (۱) مذہب اور اخلاق کے میدان میں السیوطی، ابن صلاح، السراج، الغزالی، ابن مسکویہ اور الشہرستانی، (۲)، علم التعلیم اور علم کے میدان میں القبیسی، الزرنوجی، ابن جماعت، طاش کبری زادہ، ابن عبدالبر اور الندیم، (۳) فلسفے اور نفسیات کے میدان میں الکندی، ابن طفیل، ابن باجہ، الرازی، اخوان الصفا، ابن سینا، ہبۃ اللہ، شاہ ولی اللہ، صدرالدین، قطب الدین شیرازی، صدرالدین شیرازی اور الشیرازی، (۴) سیاسیات و نظم و نسق کے میدان میں الفارابی، الجوزی، ابوعبید، ابن اخوہ، الدمشقی اور ابن خرداذبہ، (۵) قانون اور فقہ کے میدان میں ابن رشد، الزیدی، المرغینانی، الشافعی، البزدوی، ابن نجیم، الکرابسی، القرافی، الشاطبی، الماوردی اور الشیبانی، (۶) تاریخ کے موضوع پر ابن ہشام، الترمذی، البلاذری، ابن خیاط، منہاج سراج، المراکشی، الازرقی اور السخاوی، (۷) انسانیات و معاشریات کے میدان میں الاندلسی، ابن فارس، البیرونی، المسعودی، ابن خلدون، قدامہ بن جعفر اور الموصلی، (۸) کونیات، جغرافیہ اور آثاریات کے حوالے سے ابن عربی، الدمشقی، ابن حوقل، المقدسی، ابن بطوطہ، (۹) فطری علوم کے حوالے سے الدنیوری، الدمیری، ابن الہیثم، کمال الدین فارسی، الخزینی، زکریا الرازی، البتانی، قاضی زادہ رومی اور عبدالرحمان الصوفی، (۱۰) ریاضی جیسے علوم میں الکاشی، الآملی، ابن عبدالمنعم، المغربی، عمر خیام، الخوارزمی اور نصیر الدین طوسی، (۱۱) طبی علوم کے حوالے سے ابن سینا کے علاوہ الزہراوی، الشاذلی، ابن زہر، صاحب الیمنی، ابن بیطار اور ابن ابی اصیبعہ اور (۱۲) فنیات اور ٹکنالوجی میں ابن عوام، عباس بن علی، العجمی، الکرجی، الجزاری، بنو موسیٰ، ابن ماجد اور المعری شامل کیے ہیں۔

ان میں سے بعض نام دیگر علوم میں بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے جو تجاویز طلب کیں، ان کی روشنی میں حاجی خلیفہ، احمد بن سیرین، احمد فکری، الاصفہانی، ابن قتیبہ، ابن خلکان، یاقوت، ابن عبدربہ، المقری، القلقشندی،

عظیم کتب کے مطالعہ کی تحریک محض ثقافتی بچاؤ کی تحریک نہیں

ابن جبیر، ابن حزم، سعدی شیرازی، ابن دانیال، درویش محمد، سیبویہ، ابن مالک، ابن فارس، الثعلبی، مسکی، ابن ہذیل، المقریزی، الاشبیلی، الساعاتی، ابن جلجل، التیسی، الغرناطی، الحریری، قزوینی، الموفق، یاقوت، الجندی، الجاحظ، الدمیری، الادریسی، ابوالفدا، الزمخشری، جابر بن حیان، الطغرائی، الحاسب، پیری رئیس، الشجاع، الکوہی، عبدالعزیز سالم، الفرغانی، الصرفی، ثابت بن قرہ، الزرقالی، الغریری، الراقی، البریطی، ابن طفیل، ملا صدرا، البغدادی، مولانا روم، شاہ ولی اللہ، علی ہجویری، السہروردی، الجیلی، ابن کثیر، السخاوی، الطبری، المسعودی، الشاطبی، السرخسی، ابوعبیدہ، ابوسیف، ابن قیم، کے علاوہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے نام اس فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔ انہی سے ہجرہ کونسل نے سو کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔

سید حسین نصر نے "اسلامی سائنس کی مشرح کتابیات" میں اسلامی علوم پر اثر انداز ہونے والے یونانی، سامی، ایرانی، ہندوستانی، چینی مصنفین پر مسلمانوں کی تشریحات اور جائزوں کے علاوہ اٹھارویں صدی سے ۱۹۷۰ء تک الفارابی، الخوارزمی، ابن خلدون، ابن اصیبعہ، ابن خلکان، ابن ندیم، الاندلسی، الکندی، ابن سینا، الغزالی، ابن عربی اور دیگر کل تقریباً ۱۷۵ مسلمان مفکرین کی مطبوعہ تصانیف اور ان کے دنیا بھر کی زبانوں میں ترجموں نیز بنیادی تنقیدی، علمی مواد کی کتابیاتی معلومات کو درج کیا ہے۔ یہ ایک زیادہ جامع کتابیات ہے جو جارج سارٹن کا "مقدمہ تاریخ سائنس" کی فہرستوں سے قدرے بڑھ کر ہے۔

مشرق و مغرب کے مصنفین میں سے جدید سائنسی علوم کی فہرست میں آئن سٹائن جیسے عظیم ناموں کے ساتھ ساتھ، آدم کوچ (۱۸۱۹ء۔ ۱۸۹۴ء)، ایمل آرٹن (۱۸۹۸ء۔ ۱۹۶۳ء)، بوہر (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۵۱ء)، بوریل (۱۹۲۳ء -)، کیونڈش (۱۷۱۳ء - ۱۸۱۰ء)، شنگ شین چرن (۱۹۱۱ء، ۔۔۔۔)، ہمفرے ڈیوی (۱۷۷۸ء - ۱۸۲۹ء)، بنجمن فرینکلن (۱۷۰۶ء - ۱۷۹۰ء)، ہریش چندرا (۱۸۵۰ء۔ ۱۸۸۵ء)، ولیم ہرشل (۱۷۳۸ء۔ ۱۸۲۲ء)، ہوپکنز (۱۸۳۹ء۔ ۱۸۹۸ء)، لوکنگ ہو (۱۹۱۰ء - ۱۹۸۵ء)، فرٹز جان (۱۹۱۰ء

امریکا میں کئی کالجوں کی بنیاد عظیم کتابوں کے مطالعے پر رکھی گئی ہے

۔۔۔۔۔)، لیون ہک (۱۶۳۲ء۔ ۱۷۲۳ء)، میکسویل (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۵۱ء)، جیکب نکلسن (۱۸۹۰ء ۔۔۔۔۔)، کیوشی اوکا (۱۹۰۱ء - ۱۹۸۷ء)، سری نواس رامانو جان (۱۸۷۸ء - ۱۹۲۰ء)، رابن سن (۱۹۱۸ء۔ ۱۹۷۳ء)، سٹیفن سمتھ (۱۸۲۶ء - ۱۸۸۳ء)، گبرائیل سٹوکس (۱۸۱۹ء - ۱۹۰۳ء)، ولیم سٹرٹ (۱۸۴۲ء - ۱۹۱۹ء)، ولیم تھامسن (۱۸۲۴ء - ۱۹۰۷ء)، سلویسٹر (۱۸۱۴ء۔ ۱۸۹۷ء)، ٹیجی ٹکاجی (۱۸۷۵ء - ۱۹۶۰ء)، شینی چیرو ٹوموناگا (۱۹۰۶ء - ۱۹۷۹ء)، ٹاریسلی (۱۶۰۸ء - ۱۶۴۷ء)، ولیم تھامسن (۱۸۲۴ء۔ ۱۹۰۷ء)، وینو گریڈو (۱۸۹۱ء - ۱۹۸۹ء)، وولٹا (۱۷۴۵ء۔ ۱۸۲۷ء)، نیومین (۱۹۰۳ء - ۱۹۵۷ء)، واٹر سٹن (۱۸۱۱ء - ۱۸۸۳ء)، ویٹ سٹون (۱۸۰۲ء۔ ۱۸۷۵ء)، ہیڈیکی یوکاوا (۱۹۰۷ء۔ ۱۹۸۱ء)، ژوکیرمن (۱۸۹۰ء - ۱۹۷۳ء) اور یوکوفسکی (۱۸۴۷ء۔ ۱۹۲۱ء) جیسے عظیم سائنسدانوں کی تصانیف قابل توجہ ہیں۔

(جاری ہے)

****

بیرونی ممالک میں اردو

مرتب: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے عنقریب شائع ہو رہی ہے جس میں الگ الگ مضامین کی صورت میں آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا، جرمنی، برطانیہ، اطالیہ، ناروے، سویڈن، ہالینڈ، جمہوریہ چیک، فرانس، ڈنمارک، پرتگال، پولینڈ، ترکی، ازبکستان، روس، بنگلہ دیش، مقبوضہ کشمیر، بھارت، کویت، مالدیپ، سری لنکا، سعودی عرب، افغانستان، چین، بحرین، شام، جاپان، ایران، قطر، نیپال، برما، ملائیشیا، متحدہ عرب امارات، ماریشس، جنوبی افریقہ، کینیا، صومالیہ اور مصر سمیت دیگر کئی ممالک میں اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ پیش کیا گیا ہے

ماہنامہ

اخبارِ اردو

اسلام آباد

جون ۱۹۹۶ء

— نگرانِ اعلیٰ : افتخار عارف

— مدیر : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

— نائب مدیر : سید سردار احمد پیرزادہ

مقتدرہ قومی زبان

اختر راہی

شیکسپئیر کے اُردو تراجم

ولیم شیکسپیئر (۱۵۶۴ء - ۱۶۱۶ء) انگریزی زبان کا عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار ہے۔ اس نے اپنے ڈراموں میں انسانی جذبات کی اس خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے کہ صدیوں کی گردش اس کے نقشِ دوام کو نہیں مٹا سکی تقریباً ہر قابلِ ذکر زبان میں شیکسپیئر کی تخلیقات کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اس کے ڈرامے ملک ملک میں سٹیج کیے جا رہے ہیں اور ان پر مبنی خوب سے خوب تر فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔ اردو کے سرمایۂ ادب میں ہزاروں تراجم کے ساتھ شیکسپیئر کے تراجم کا ایک معقول ذخیرہ ملتا ہے۔

ولیم شیکسپیئر سے ۳ کتب یادگار ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں میر حسن ایم۔ اے نے مغربی تصانیف کے تراجم کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا:

> "اُردو میں اس وقت شیکسپیئر کے ۱۹ ڈراموں کے ترجمے موجود ہیں۔ ان میں سے بعض ڈرامے مثلاً کامیڈی آف ایررز اور مرچنٹ آف وینس ایسے ہیں جن کے ترجمے تین تین چار چار مترجمین نے مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ شائع کیے ہیں۔"[1]

۱۹۳۹ء کے بعد بھی مسلسل ترجمے ہوتے رہے اور ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اطلاع دی کہ:

> "اس وقت شیکسپیئر کے ۳۷ ڈراموں میں سے ۲۲ ڈراموں کے اکتیس اُردو ترجمے پیش نظر ہیں۔"[2]

ڈاکٹر نامی کی تحقیقی کتاب کے بعد بھی تراجم شائع ہوتے رہے اور اب ان کی تعداد میں ۳۵ مزید تراجم کا اضافہ ہو چکا ہے۔

برصغیر میں تھیٹر اور ڈرامہ نگاری کے فن کا آغاز انگریزوں کی آمد سے ہوا۔ انہوں نے یہاں ڈرامے سٹیج کیے اور بمبئی میں انیسویں صدی کی ابتدا میں بمبئی تھیٹر کے نام سے ایک عمارت بھی بن گئی۔ اس تھیٹر میں پہلا کھیل ۱۸۰۶ء میں کھیلا گیا اس تھیٹر سے بمبئی کی پارسی آبادی نے اثرات قبول کیے۔ نوجوان طلبہ نے ڈراموں میں حصہ لینا شروع کیا اور انگریزی ڈراموں کے حوالے سے گجراتی اور اردو میں ڈرامے لکھنے اور سٹیج کرنے کی روایت کا آغاز ہوا چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں ڈرامے سٹیج کرنے والوں کے منظم گروہ موجود تھے اور ان کے لیے ڈرامے لکھے جا رہے تھے۔

شیکسپیئر کی تخلیقات اردو میں کب منتقل ہونا شروع ہوئیں؟ موجودہ تحقیق کے مطابق ۱۷۹۶ء میں جان گل کرسٹ نے شیکسپیئر کے دو اقتباسات کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کا مقصود ان تراجم سے نہ تو شیکسپیئر کو اردو دان آبادی سے متعارف

[1] مغربی تصانیف کے اردو تراجم ص: ۱۳۱

[2] اردو تھیٹر جلد اول ص:

کراناتھا اور نہ اس کی فنی بلندی اور ادبی مقام پر زور دینا تھا۔ ۱۷۹۶ء میں جان گل کرسٹ نے "ہندوستانی زبان کے قواعد" (A GRAMMER OF THE HINDOOSTANEE LANGUAGE) میں اپنے ہم وطنوں کو اردو زبان سے روشناس کرانے کے لیے "شاہ ہنری ہشتم" اور "ہیملٹ" سے دو اقتباسات اور ان کا ترجمہ دیا۔

شیکسپیئر کی مستقل تخلیقات میں سے ۱۸۷۱ء میں PERICLES کا نثری ترجمہ "داد دریا" کے نام سے ہوا۔ یہ ترجمہ دادا بھائی پٹیل نے کرایا تھا۔ مترجم کون تھا؟ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا مگر دادا بھائی اور نوشیروان جی مہربان جی آرام کے روابط اور دوسرے تراجم کو دیکھتے ہوئے اسے بھی آرام کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ آرام کے دوسرے تراجم میں "مرچنٹ آف وینس" کا ترجمہ "جواں بخت" بھی شامل ہے۔

اگر Pericles کے ترجمے کو آرام کی کاوش سمجھا جائے تو آرام ہی کو اولیت حاصل ہے جس نے سب سے پہلے شیکسپیئر کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ اور اگر Pericles کو اس کی تالیف نہ سمجھا جائے تو مرچنٹ آف وینس کے حوالے سے اُسے اولیت حاصل رہے گی۔

تھیٹر کے آغاز سے اب تک شیکسپیئر کے تراجم کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ تھیٹر کے بعد فلموں کا دور آیا تو یہاں بھی شیکسپیئر کی پہلے جیسی مقبولیت قائم رہی۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

مترجمین نے بعض اوقات کرداروں کے نام بدل دیے۔ کبھی پلاٹ اور مکالموں کا بڑا حصہ قائم رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اضافے کر دیے اور کبھی تلخیص سے کام لیا۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ برصغیر اور انگلستان کے ماحول میں جو فرق ہے اس کے پیش نظر اصل اور تراجم میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ ذیل میں شیکسپیئر کے مترجمین اور اُن کی کاوشوں کے بارے میں جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں، یکجا پیش کی جارہی ہیں۔

* AS YOU LIKE IT

۱۔ احسان اللہ — قصۂ مرغوب الطبع (۱۸۹۰ء)

۲۔ چرن داس — دلپذیر (۱۹۰۱ء)

۳۔ پنڈت نرائن پرشاد بے تاب دہلوی — جو آپ پسند کریں۔ [ماہنامہ شیکسپیئر (بمبئی)، میں ۱۹۰۶–۰۷ء میں شائع ہوا]

۴۔ ولایت حسین — پسندِ خاطر لکھنؤ۔ اشاعت العلوم (۱۹۲۶ء) ص۔ ۱۴۰

۵۔ راجہ رشید احمد — عالمِ محبت (۱۹۲۸ء)

۶۔ سعید الحق عاشق دسنوی — من کی چاہ

* The Comedy of Errors

۱۔ احسان اللہ — بھول چوک (۱۸۹۰ء)

۲۔ مرزا نظیر بیگ نظیر اکبر آبادی — بھول بھلیاں (۱۸۹۶ء)

۳۔ فیروز شاہ خان — بھول بھلیاں (۱۸۹۶ء)

۴۔ محمد افضل خان — بھول بھلیاں لاہور۔ چمن داس (۱۹۱۰ء) ص۔ ۲۸

۵۔ پنڈت بے تاب — گورکھ دھندا (۱۹۱۱ء) یہ ڈرامہ پہلی بار الفریڈ ناٹک منڈلی نے بریڈلا ہال لاہور میں سٹیج کیا تھا۔

۶- عبدالکریم - بھول بھلیاں
(۱۹۱۳ء)

۷- گینشر داس گوہر - گورکھ دھندا
(۱۹۲۱ء)

۸- لالہ سیتا رام الہ آبادی - بھول بھلیاں

۹- افسوں شاہجہانپوری - ربط و ضبط عرف
بھول بھلیاں

* Romeo and Juliet

۱- احسان اللہ - رومیو جولیٹ
(۱۸۹۰ء)

۲- منشی جوالا پرشاد برق سیتاپوری -
معشوقۂ فرنگ عرف گلنار فیروز
لکھنؤ - مطبع منشی نولکشور
(۱۸۹۶ء)

۳- شیر خان - گلنار فیروز
(۱۸۹۶ء)

۴- میر مہدی حسن خان احسن لکھنوی - بزمِ فانی
عرف گلنار فیروز
(۱۸۹۸ء)

۵- مرزا نظیر بیگ نظیر اکبرآبادی - رومیو جولیٹ
عرف عشق فیروز لقا گلنار پیکر
(فروری ۱۹۰۴ء)

۶- محمد افضل ہمدم - بزمِ فانی عرف گلنار فیروز
(۱۹۰۷ء)

۷- جی - ایل سیٹھی - گلنار فیروز
(۱۹۰۹ء)

۸- امراؤ سنگھ - رومیو جولیٹ
آگرہ - مطبع الٰہی (۱۹۱۲ء)
ص - ۳۲

۹- عشی بدایونی - بزمِ فانی عرف دھوکا دھڑی

۱۰- عنایت اللہ دہلوی - رومیو جولیٹ

۱۱- عبداللطیف شاد - تاجدار جوگن
(۱۹۲۲ء)

۱۲- عزیز احمد - رومیو جولیٹ
کراچی - انجمن ترقی اردو پاکستان
(۱۹۶۱ء)-

۱۳- — رومیو جولیٹ

* The Merchant of Venice

۱- نذر محمد بن فتح علی - تاجر وینس
بمبئی (۱۸۸۳ء)

۲- بابو بالیشور پرشاد بی - اے - وینس کا سوداگر
(۱۸۸۷ء)

۳- — - چاندشاہ سود خور
(۱۸۹۵ء)

۴- عاشق حسین - دی مرچنٹ آف وینس
(۱۸۹۶ء)

۵- میر مہدی حسن احسن لکھنوی - دل فروش
(۱۹۰۰ء)

۶- اکبر علی خان افسوں شاہجہانپوری - دل فروش
عرف یہودی سوداگر

۷- نظیر اکبرآبادی - آئینۂ دلفروش

۸- گوہر رامپوری - عشق قاسم و شیریں عرف دلفروش

* Julius Caesar

۱- سید تفضل حسین - جولیس سیزر
حیدرآباد دکن - اختر دکن
پریس (۱۹۲۳ء)

۲- عنایت اللہ دہلوی - جولیس سیزر

۳ - شمشاد حسین صدیقی - جولیس سیزر
۴ - سید فیض الحسن فیضی - جولیس سیزر
لاہور - مکتبۂ کاروان

Hamlet

۱ - احسان اللہ - شہزادہ ہیملٹ
(۱۸۹۰ء)

۲ - امراؤ علی لکھنوی - جہانگیر
(۱۸۹۵ء)

۳ - افضل خان - ہیملٹ
(۱۹۰۲ء)

۴ - نظیر اکبر آبادی - کھیل ہیملٹ نوایجاد عرف واقعہ جہانگیر ناشاد
آگرہ (۱۹۰۴ء)

۵ - میر مہدی حسن احسن لکھنوی - خون ناحق عرف مار آستین
امرتسر - گھنیا لال اینڈ برادرز
(۱۹۱۷ء) - ص ۷۳

۶ - عابد نواز جنگ - ہیملٹ
سہ ماہی اردو (دہلی) بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں شیکسپیئر کے چند بند کا ترجمہ کے زیر عنوان کچھ حصہ شائع ہوا تھا۔ ترجمہ نظم معریٰ میں ہے۔

۷ - امتیاز علی بی۔ اے - ہیملٹ
۸ - فراق گورکھپوری - ہیملٹ
۹ - سید عبدالباقی - ہیملٹ
[غیر مطبوعہ]

۱۰ - تلسی داس دت شیدا - خون ناحق عرف ہیملٹ
لاہور - دیا سنگھ پبلشرز
(۱۹۱۲ء) ص ۲۲

Othelo

۱ - احسان اللہ - اوتھیلو
(۱۸۹۰ء)

۲ - احمد حسین خان - جعفر
(۱۸۹۵ء)

۳ - منشی جوالا پرشاد برق سیتاپوری - آتھیلو
(۱۸۹۶ء)

۴ - میر مہدی حسن احسن لکھنوی - شہید وفا
(۱۸۹۸ء)

۵ - دینا ناتھ فتح آبادی - مار آستین
(۱۹۰۳ء)

۶ - گوپال گویل - اوتھیلو
(۱۹۱۱ء)

۷ - نظر دہلوی - شیر دل
(۱۹۱۹ء)

۸ - سجاد حسین جوہر بناری - اوتھیلو عرف جنجل خور آئینہ
۹ - نازاں دہلوی - وہمی جنگی
۱۰ - حامد عزیز مدنی - اوتھیلو [نظم معریٰ]
سہ ماہی غالب (کراچی) بابت جنوری و اپریل ۱۹۷۵ء کی دو اشاعتوں میں کچھ حصے شائع ہوئے تھے۔

۱۱ - مفتی اشتیاق حسن عثمانی - اوتھیلو
۱۲ - سید قاسم محمود - اوتھیلو
لاہور - کلاسیک

۱۳ - سجاد ظہیر - آتھیلو
دہلی - ساہتیہ اکادمی (۱۹۶۸ء)
ص - ۱۶۸

* Macbeth

۱۔ سہراب جی پستن جی کانگا۔ تلاطم ایران
حیدرآباد دکن

۲۔ آغا حشر کاشمیری۔ فریب ہستی
(۱۹۰۸ء)

۳۔ عنایت اللہ دہلوی۔ میکبتھ
سالنامہ ساقی (۱۹۳۸ء)
میں شائع ہوا۔

۴۔ سید قاسم محمود۔ میکبتھ

* Antony and cleopatra

۱۔ منشی انوار الدین مخلص۔ کالی ناگن عرف زن مرید

۲۔ ایم۔ ایچ حیران لکھنؤ آبادی۔ کرشمۂ شباب عرف
مارِ آستین

۳۔ عنایت اللہ دہلوی۔ انتونی اور کلیو پیترہ
دہلی۔ ساقی بک ڈپو (س۔ن)
ص ۲۱۶

۴۔ شان الحق حقی۔ انطونی اور کلیوپترا
کراچی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان
(۱۹۸۴ء)

* Richard III

۱۔ پنڈت نرائن پرشاد بے تاب دہلوی۔ رچرڈ سوم
بمبئی۔ ترقی پریس (۱۹۰۷ء)
ص ۱۵۰

۲۔ آغا حشر۔ صید ہوس
(۱۹۰۶ء)

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی رائے یہ ہے
کہ آغا حشر نے کنگ جان اور رچرڈ
سوم کے اشتراک سے یہ ڈرامہ بنایا ہے۔

۳۔ کیقباد پستن جی۔ کنگ رچرڈ

(۱۹۰۷ء)

* Titus and Ronicus

۱۔ عبداللطیف شاد۔ جنونِ وفا
(۱۹۰۰ء)

* LovE $ Labourslost

۱۔ محمد سلیمان۔ یاروں کی محنت برباد
(۱۸۹۹ء)

* The Taming of the Shrew

۱۔ ــ ــ بجلی دلہن

۲۔ احسان اللہ۔ بدمزاج کا سرکرنا

* A Midsummer Night's Dream

۱۔ احسان اللہ۔ موسم گرما کا خواب
(۱۸۹۰ء)

۲۔ امیر احمد علوی۔ خواب پریشان
اودھ پنچ اخبار میں ۱۶ر اگست
تا ۲۲ر نومبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا
لکھنؤ (۱۹۳۴ء)

۳۔ محمد اظہر علی آزاد کاکوروی۔ جامِ الفت
گورکھپور (۱۹۰۳ء)

۴۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ ساون رین کا سپنا

* King John

۱۔ ــ ــ داؤ پیچ
(۱۹۰۲ء)

* Much Ado About Nothing

۱۔ احسان اللہ۔ ذرا سے کام کا اتنا طومار
(۱۸۹۰ء)

۲۔ لالہ سیتا رام۔ جامِ الفت
(۱۹۰۶ء)

۳۔ فانی بدایونی نے بھی ترجمہ کیا تھا۔

* Henry V

۱۔ سید تفضل حسین ۔ تسخیر فرانس
ماہنامہ الناظر (لکھنؤ) بابت
جولائی تا دسمبر ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا
لکھنؤ۔ الناظر بک ڈپو (۱۹۱۳ء) ص ۹۶

۲۔ سعید الحق عاشق دسنوی ۔ ہنری پنجم

* Twelfth Night

۱۔ غنی بدایونی ۔ بھول بھلیاں

۲۔ سعید الحق عاشق دسنوی۔ خوش انجام
دہلی (س۔ن)۔ ص ۱۰۰

۳۔ شریف احمد شہباؔ۔ "بارہویں رات" یا "جو آپ چاہیں"
کراچی (۱۹۵۵ء)

* Measure for Measure

۱۔ احسان اللہ ۔ جیسے کو تیسا
(۱۸۹۰ء)

۲۔ آغا حشر ۔ شہید ناز عرف اچھوتا دامن
(۱۹۰۲ء)

* All is Well That Ends Well

۱۔ احسان اللہ ۔ انجام بخیر تو سب کچھ بخیر
(۱۸۹۰ء)

۲۔ ۔ ۔ حسن آرا
(۱۹۰۰ء)

* King Lear

۱۔ لالہ ستیارام ۔ اردو شیکسپیر عرف اردو ترجمہ
کنگ لیئر
لکھنؤ (۱۸۹۹ء)

۲۔ غنی بدایونی ۔ سفید خون

۳۔ مراد علی لکھنوی ۔ ہارا جیتا یا ہار جیت
(۱۹۰۵ء)

۴۔ آغا حشر ۔ سفید خون
(۱۹۰۷ء)

۵۔ بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری ۔ شاہ لیئر
(۱۹۲۱ء)

۶۔ عنایت اللہ دہلوی ۔ شاہ لیئر
ماہنامہ ساقی (دہلی) کے سالنامہ
(۱۹۳۹ء) میں چھپا۔

* Cymbeline

۱۔ ۔ ظلم نا روا
(۱۸۹۹ء)

۲۔ محمد عبد العزیز ۔ سمبلائن
(۱۸۹۳ء)

۳۔ مصطفیٰ اسید علی ۔ میٹھا زہر
(۱۹۰۱ء)

۴۔ پنڈت بے تاب دہلوی ۔ میٹھا زہر عرف فریب محبت

۵۔ لالہ دینا ناتھ ۔ آئینۂ عصمت
لاہور ۔ حکیم رام کشن (۱۹۱۴ء)
ص ۳۷

* The Winter's Tale

۱۔ آغا حشر ۔ مرید شک
دہلی (۱۹۰۰ء)

۲۔ مرزا اتقی حسین ۔ وہم و گمان

۳۔ غنی بدایونی ۔ زہری ناگن عرف داغ جگر

* The Tempest

۱۔ بے تاب دہلوی ۔ خداداد
(۱۸۹۶ء)

۲۔ شفیع الدین خان مراد آبادی ۔ تیز نگاہ
(۱۸۹۷ء)

* Pericles

۱۔ ۔ داد و دریا

(۱۸۹۱ء)

* Henry IV

۱۔ وقار احمد سید - ہنری چہارم

مذکورہ بالا مستقل تراجم کے علاوہ بعض مترجمین اور شعراء نے مخصوص اقتباسات کے ترجمے کیے ہیں۔

تیج رام نے ۱۸۹۹ء میں "گلزارِ شیکسپیئر" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اسی طرح سردار جعفری نے "شیکسپیئر کی کہانیاں" کا ترجمہ کیا جو شیکسپیئر کے ڈراموں کی افسانوی تشکیل پر مبنی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح احمد حسین خان نے "آبشارِ سخن" کے نام سے شیکسپیئر کے سوٹے شاہکاروں کا ترجمہ کیا۔

ادارہ پنجاب بکڈپو۔ لاہور نے بچوں کے لیے شیکسپیئر کے ڈراموں پر مبنی کتابچوں کا ایک سیٹ شائع کیا تھا۔

مصطفیٰ زیدی نے ہیملٹ کے ایک اقتباس کا ترجمہ کیا جو اُن کے مجموعۂ کلام "موج میری صدف صدف" میں شامل ہے اسی طرح تلوک چند محروم نے کچھ ڈراموں کے اہم حصوں کا منظوم ترجمہ نکاتِ شیکسپیئر کے نام سے کیا۔

——— ○ ———

[اس مقالے کی ترتیب میں حسبِ ذیل کتب اور مقالات سے مدد لی گئی ہے۔

سلیم الدین قریشی — فہرست کتب اردو (ضمیمہ فہرست کتب بلوم ہارٹ) انڈیا آفس لندن (۱۹۸۲)

ظ۔ انصاری — کتاب شناسی دہلی (۱۹۸۳ء)

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی — اردو تھیٹر جلد اوّل۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی (۱۹۶۲ء) جلد دوم۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۶۲ء) جلد سوم۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۶۲ء)

میر حسن ایم۔ اے — مغربی تصانیف کے اردو تراجم حیدرآباد دکن (۱۹۳۱ء)

The National Bibliography of
Indian Literature 1901-1953
Vol. IV.
B.S.Kesa Wan

دہلی (۱۹۶۲ء)

خاطر غزنوی — سہ ماہی اردو نامہ (کراچی) شمارہ ۱۷

عشرت رحمانی — ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (لاہور)

اصطلاح سازی

"اصطلاح سازی بہرحال ضروری ہے۔ نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ لینے ہوں گے، ہاں حالی کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ نئے الفاظ نئے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں۔ اردو کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جدید اصطلاحیں بنائے بغیر چارہ نہیں، مگر کوئی جدید چیز بالکل جدید نہیں ہوتی۔ یہ کسی پرانی اور بھولی بسری روایت کی تجدید، توسیع یا ترمیم ہوتی ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سارے خزانے کو کھنگالیں، پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لیں اور نئی چیزوں، نئے خیالات، نئے لفظوں کو حسبِ ضرورت اختیار کریں۔

نظر اور نظریے
آلِ احمد سرور
ص ۲۷۰ - ۲۷۱

3:02 PM

https://www.rekhta.org/ebook

اخبار اردو، اسلام آباد

ماہنامہ

اخبارِ اردو

اسلام آباد

جلد: ۳ — جولائی ۱۹۸۵ء — شمارہ: ۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس شمارے کے اہم مضامین

ڈاکٹر وحید قریشی

مدیر مسئول

شریف کنجاہی

مدیر اعزازی

اختر راہی

نائب مدیر اعزازی

1

28
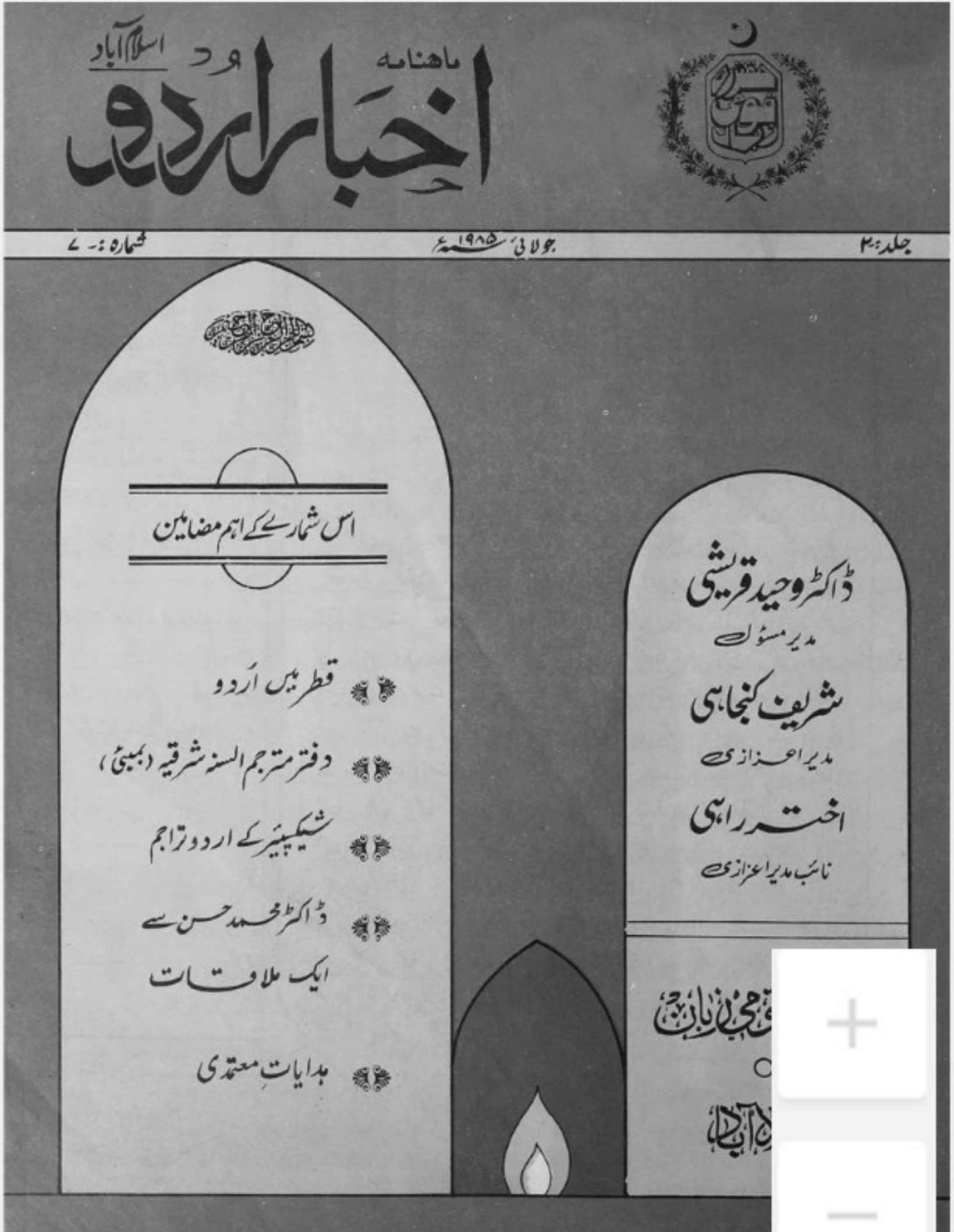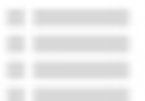
جلد :۲۱ شمارہ : ۸ اگست ۲۰۰۵ء

ادارے کا مضمون نگاروں کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں

مندرجات

مقتدرہ قومی زبان کا ترجمان

ماہنامہ اسلام آباد

اخبارِ اُردو

نگران
پروفیسر فتح محمد ملک

مدیر
سید سردار احمد پیرزادہ

تزئین و اہتمام
تجمل شاہ

کمپوزکاری
اقبال خان رند

پروف خوانی
نور محمد خاور

فون : ۹۲۵۰۳۱۱، ۹۲۵۰۳۱۲،
۹۲۵۰۳۱۳
فیکس : ۹۲۵۰۳۱۰
ای میل : nlapak@apollo.net.pk.
پتا: مقتدرہ قومی زبان، پطرس بخاری روڈ،
ایچ ۸/۴، اسلام آباد (پاکستان)

شرح خریداری
روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے
ڈرافٹ / منی آرڈر بنام مقتدرہ قومی زبان)

اسلام آباد، فون صدر نشین: ۹۲۵۰۳۱۴،
اسلام آباد، فون: ۲۲۷۵۲۹۰

⁎ شکیل احمد منگلوری ⁎

مقتدرہ قومی زبان سے عظیم عالمی کتب کے اردو تراجم کے اشاعت پر "اخبار اردو" کی طرف سے ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انوار حسین صدیقی نے فرمائی، صاحبان فکر و دانش میں سے ڈاکٹر خالد مسعود، محترمہ ثاقبہ رحیم الدین، ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی، ڈاکٹر محمد میاں صدیقی اور ڈاکٹر عطش درانی شریک گفتگو ہوئے۔

افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے مقتدرہ قومی زبان کے صدرنشین افتخار عارف نے مذاکرے میں شریک اہل علم کو خوش آمدید کہا اور منصوبے کی اہمیت پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ یہ منصوبہ سے پیش رو ڈاکٹر جمیل جالبی کے عہد میں شروع ہوا تھا، میں نے اس کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ صرف اسے جاری رکھا بلکہ اس منصوبے کے خد و خال اجاگر کرنے کی بھی مقدور بھر کوشش کی، جس کے نتیجے میں آج دس عظیم کتابیں علم دوست قارئین کو پیش کی جارہی ہیں، پاکستان کے جشن طلائی کی مناسبت سے یہ پچاس کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ ہے جس کی باقی کتابیں بھی انشا اللّٰہ مستقبل قریب میں منظر عام پر آرہی ہیں۔

ڈاکٹر خالد مسعود:

تراجم کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے عباسی دور میں اسلامی دارالحکمت کی بنیاد نظر آتی ہے۔ پھر سر سید احمد خان کی سائنٹیفک سوسائٹی ہے جو اسی قسم کے کاموں کے لیے قائم کی گئی تھی۔ انجمن ترقی اردو، بیورو کونسل کے علاوہ ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرف سے بھی تراجم کا ایک اہم سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ تراجم کے بہت سارے مسائل ہیں۔ ترجمے کا ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے ادب کی دوسری معاشرت کی، دوسرے فکر کی اہم کتابوں کو اپنے ہاں منتقل کریں۔ مسلمانوں کے ہاں یہ مسئلہ عباسی دور میں ہی سامنے آگیا تھا کہ ترجمہ کیسے ہو۔ کچھ ترجمے تو اس زمانے میں لفظی کیے گئے، یونانی کے لفظ کو عربی کا لفظ دے دیا گیا۔ کچھ تحت اللفظ قسم کے ترجمے کیے گئے، کچھ جملوں کی ترکیبیں وہی کی وہی رکھی گئیں اور اس کے ساتھ ہی کلامی طور پر قرآن مجید کے ترجمے کا مسئلہ بھی پیش آیا۔ قرآن کا ترجمہ یا کسی الہامی کلام کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ ساری خاصیتیں اس میں نہیں آسکتیں چنانچہ ہمارے اکثر علما کا فیصلہ یہی تھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ صرف تفہیم کے لیے کیا جائے تو عربی عبارت اس کے ساتھ دی جائے لیکن ہوا یہ کہ اسلامی معاشرت میں یہ مسئلہ دوسرے علوم و فنون کے لیے بھی اتنا ہی اہم سمجھا گیا اور اس وجہ سے ترجمہ نگاری میں کافی رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ ہمارے ہاں تراجم میں کوشش یہ کی گئی کہ زیادہ سے زیادہ اصل کے قریب رہا جائے۔ اصل کے قریب رہنے میں بہت ساری دقتیں ہیں اور وہ ہمارے بہت سارے تراجم میں سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ اسلوب زبان کا ہے کہ جس زبان سے آپ ترجمہ کر رہے ہیں، اس کا اسلوب اس زبان سے مختلف ہے جس میں آپ ترجمہ کر رہے ہیں۔ پھر معاشرت کا بھی مسئلہ ہے کہ جس معاشرت میں وہ پہلی کتاب لکھی گئی ہے اس کا پس منظر اور سیاق و سباق کچھ اور ہے اور ترجمے کی زبان کا اس سے مختلف ہے۔ پھر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں علما، علما کے لیے لکھتے تھے، عام آدمی کے لیے نہیں لکھتے تھے۔ عام آدمی کو جو بات آپ سمجھانا چاہتے ہیں، اس کے مسائل، اس کی دقتیں سامنے ہوتی چاہئیں اور یہ ایک طرح سے آپ کی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ آپ اس تک پہنچانا چاہتے ہیں وہ آپ پہنچانے کے قابل ہوں۔ خاص طور پر ترجمے میں یہ دقت اس لیے زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ اس میں بہت ساری اصطلاحات، بہت سارے مسائل سامنے آتے ہیں، جو کہ قاری کی سطح فہم سے اونچے ہوتے ہیں۔ اس

ڈاکٹر خالد مسعود

تخلیقی کتابوں کا ترجمہ مشکل ترین تجربہ ہوتا ہے

ترجمہ نگار ترجمہ کرتے وقت تخلیق کے عمل کو دوبارہ اپنے اوپر طاری کرتا ہے

کے لیے مترجم کو ایک گوناں کوشش اور کرنی پڑے گی کہ وہ قاری کو مطالب تک لے آئے۔ ترجمہ کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔ جس زبان سے آپ ترجمہ کر رہے ہیں، جس زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں اور جس مضمون کی بات ہو رہی ہے، اس میں مترجم کو عبور نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ قاری تک مطالب کو قابل فہم بنا کر پہنچا سکے۔

زبان کے جو مسائل مقتدرہ کی شائع کردہ عظیم کتابوں کے حوالے سے سامنے آتے ہیں ان کے مطابق چار اہم مسئلے بنتے ہیں۔ ایک تو اصطلاحات کا ہے جس کو ہم عام طور پر جانتے ہیں۔ دوسرا ہے جملے کی ترکیب کا۔ اردو میں جملے کی ترکیب ابھی تک میرے خیال میں سادہ ہے جبکہ دوسری زبانوں انگریزی اور عربی میں پیچیدہ ہے۔ کئی کئی جملے ایک جملے سے منسلک ہو کر ایک لمبے جملے کی روایت قائم کرتے ہیں۔ اس وجہ سے جب ایسے جملے کو اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس سے بہت ساری دقتیں پیش آتی ہیں۔ ایسے لمبے جملوں کا ترجمہ کرتے وقت اردو میں جملوں کو توڑ دینا چاہیے۔ خاص طور پر جرمن زبان میں تو بہت ہی مشکل پیش آتی ہے کہ اس میں بہت لمبے جملے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ پورا صفحہ ایک جملے کا یا پورا پیراگراف ایک ہی جملے کا ہوتا ہے۔ پھر ایک مسئلہ محاورات کا ہے۔ محاورات کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی بات جو اردو میں ایک با محاورہ طریقے سے کی جاسکتی ہے خواہ وہ لفظی طور پر اس کا ترجمہ نہ ہو زیادہ بہتر ہے کہ آپ اس کو اس محاورے میں ادا کریں۔ بجائے اس کے کہ خلاف محاورہ ترجمہ کیا جائے۔ چوتھا مسئلہ ضمائر کا ہے۔ ضمائر کا مسئلہ زیادہ تر عربی، جرمن اور فرانسیسی سے ترجمہ کرنے میں پیش آتا ہے۔ اگر ہم ضمائر کی اسی طرح پابندی کریں جس طرح کہ اصل میں ہے تو مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا، وہاں ہمیں کہیں نہ کہیں یا تو اس جملے کو توڑنا پڑے گا یا اپنی طرف سے وضاحت کے لیے جو اصل نام ہیں ان کو ضمائر کی جگہ لانا پڑے گا۔ ایک اور مسئلہ جو ترجمے میں سامنے آتا ہے وہ اجزائے جملہ کی ترکیب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کو زیادہ بہتر انداز سے کیسے کیا جائے۔ دراصل اردو کا ایک اپنا مزاج ہے، اس کے مطابق جملے کے جو اجزا ایک خاص تعلق کی وجہ سے قریب قریب آنے چاہئیں اگر ان کو دور رکھا جائے تو اس سے مطلب واضح نہیں ہوتا یا کم از کم ذہن پیچھے رہ جاتا ہے۔ انگریزی یا فرانسیسی میں تو یہ چلتا ہے لیکن اردو میں اس کی وجہ سے کافی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ایک آخری مسئلہ نقل حرفی کا ہے۔ اس کو بھی طے کر لینا چاہیے۔ مقتدرہ کی عظیم کتب کے تراجم میں جو طریقہ اپنایا گیا ہے وہ بھی صحیح ہے۔ لیکن میرے خیال میں اسے زیادہ سائنسی بنیادوں پر حل کرنے کی ضرورت ہے یعنی یورپی نام یا یورپی زبانوں کے الفاظ کو کیسے لکھا جائے۔ ایک تو مقتدرہ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے کہ املا کی صحت کے ساتھ وہ لفظ انگریزی میں لکھ دیا جائے لیکن بہتر ہوگا کہ اس کے لیے بھی کوئی ترکیب کی جائے، اور یہ کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے۔ اگر مقتدرہ اس کی طرف توجہ دے سکے اور جو کام اس سے قبل ہوا ہے اس کو بھی سامنے رکھا جائے تو آئندہ کے لیے بہتر لائحہ عمل طے کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر انوار صدیقی:

سب سے پہلے تو میں مقتدرہ کے سکالروں کو دل کی گہرائی سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اتنا مفید کام شروع کیا ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر عطش درانی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں بیان بھی کیا ہے کہ یہ کتابیں تہذیب انسانی کا ایک مشترک ورثہ ہیں اور شروع سے اب تک جو علمی کاوشیں ہوئی ہیں ان میں مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں اور مختلف علاقوں کے بڑے بڑے زعما، فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں اور سائنسدانوں کے اہم کرادر ہیں۔ اب تو علم کی ترقی کی رفتار بہت بڑھ گئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پرانی علمی کاوشوں سے موجودہ نسلوں کو متعارف کرانا انتہائی ضروری ہے تاکہ اس تہذیبی سفر کی داستان اور اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے اور لوگوں کو اندازہ ہو کہ انسانی تہذیب اور انسانی علم کن مراحل سے گزرا ہے اور کن بڑے بڑے عالموں کا اس میں حصہ ہے۔ مقتدرہ کو اللہ کے فضل سے شروع ہی سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے عظیم سکالروں کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ یہ ادارہ بہت خوش قسمت

ڈاکٹر انوار حسین صدیقی

ہے کہ بہت ہی مقتدر حضرات اس کے سربراہ رہے اور سب ہی نے اپنے اپنے انداز میں اس کام کو آگے بڑھایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساری کسر نفسی کے باوجود موجودہ صدر نشین افتخار عارف کی موجودگی سے مقتدرہ کی سرگرمیوں میں مزید نکھار پیدا ہوا ہے۔ امید ہے کہ انشاءاللہ آئندہ سالوں میں ان کی نگرانی میں مقتدرہ اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں سارے عالمی علمی ذخیروں کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے اپنی کوششوں کا آغاز کر سکے گا۔ جہاں تک عظیم کتابوں کی اشاعت کا تعلق

ہے، سب سے پہلے تو میں کہوں گا کہ تراجم کے لیے جن کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بہت ہی موزوں اور اہم ہیں۔ ابتدائی طور پر جو دس کتابیں ترجمے کے لیے منتخب کی گئی ہیں وہ ایک بہت ہی اچھا انتخاب ہے۔ ان میں سارے ترجمے نئے نہیں ہیں۔ کچھ تراجم اس سے قبل ہوچکے ہیں لیکن اس وقت نایاب تھے' تو اس میں کوئی ہرج نہیں کہ اگر پہلے کوئی اچھا ترجمہ ہوچکا ہے تو اجازت لے کر اس کی طبع ثانی کروائی جائے۔ تو یہ ایک اچھی روایت ہوگی۔ ابھی خالد مسعود صاحب تراجم کے سلسلے میں کچھ اصول بیان کررہے تھے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ خصوصی طور پر طبعی علوم یا ٹیکنالوجی کے میدان میں کچھ کتابیں منطبق کی جائیں اور خالد صاحب کے تیسرے اصول کے مطابق یعنی دونوں زبانوں کے علاوہ نفس مضمون کی مہارت بھی ضروری ہے، کا خیال رکھا جائے تو اصطلاحات کے تراجم کی منتقلی کو ہمارے جیسے قارئین کے لیے سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ اگرچہ ان تینوں مہارتوں کا کسی ایک شخص میں جمع ہونا مشکل کام ہے تاہم اگر ایسا موزوں شخص نہ مل سکے تو ٹیم ورک کے متعلق بھی سوچا جاسکتا ہے۔ دو یا تین حضرات مل کر اگر کوئی کاوش کرسکیں تو بہتر ہوگا

پرانی علمی کاوشوں سے موجودہ نسلوں کو متعارف کروانا ضروری ہے تاکہ تہذیبی سفر کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے

تاکہ مستند ترجمہ سامنے آئے۔ اس کے علاوہ تمام اداروں کو مل کر اردو کے فروغ کے سلسلے میں تراجم کے اس کام کو آگے بڑھانا چاہیے۔ اردو کے فروغ اور تراجم کے سلسلے میں دوسرے ممالک کے ساتھ بھی تعاون کرنا چاہیے کیونکہ اردو اب صرف پاکستان کی زبان نہیں رہی۔ اردو تو اب ایک بین الاقوامی زبان ہے اور مجھے یاد آیا کہ افتخار عارف صاحب جب لندن میں تھے تو وہاں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اردو کے فروغ کے لیے بہت کردار ادا کیا تھا۔ پورے یورپ بلکہ مشرق وسطیٰ اور دوسرے ممالک میں جگہ جگہ جہاں اردو داں پہنچے ہیں، انھوں نے وہاں اردو کی شمع جلائی ہوئی ہے اور تحقیقی کام بھی ہورہا ہے۔ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو کے فروغ کے لیے کام ہورہا ہے اس کو مربوط کرنے کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مقتدرہ اس سلسلے میں ایک نمایاں کردار ادا کرسکتا ہے۔ میں امید کرتا کہ یہ سو کتابیں چھپ جائیں گی تو ان کی مارکیٹنگ بھی بہت ضروری ہوگی یہ کتابیں ہمارے گودام کا بوجھ نہیں بنتی چاہئیں بلکہ ان کو پھیلایا جانا چاہیے۔ ممکن حد تک قیمتیں لوگوں کی استطاعت کے مطابق رکھی جانی چاہئیں۔

بیگم ثاقبہ رحیم الدین:

خاصے برس گزر گئے ہیں کہ اس ادارے

بیگم ثاقبہ رحیم الدین

سے میرا تعلق ہے۔ اس تعلق کو دیکھتے ہوئے میں کہوں گی کہ ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ بہت اچھا اور وافر کام کیا ہے۔ لیکن ایک درجہ وہ آتا ہے جہاں کسی بھی ادارے کو اپنی رفتار تیز کرنی پڑتی ہے یعنی ہمیں اس رفتار میں تیزی لانی پڑتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس دور میں مقتدرہ کے کاموں میں ایک طرح سے زیادہ شدت پیدا ہوئی ہے اور یہ وقت کا تقاضا بھی ہے، ایسا ہونا بھی چاہیے تھا بلکہ میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ نصف صدی گزرنے پہ بھی ہم اپنی زبان کے لیے وہ کچھ نہیں کرسکے جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔ ترجمے کے سلسلے میں سب نے بڑی تفصیل سے بات چیت کی لیکن میں صرف یہ کہوں گی کہ ترجمہ ایک بہت بڑی قوت ہے۔ تمام ملکوں سے رابطوں کی بھی اور ایک دوسرے کی علمی اور ادبی کاوشوں کے سمجھنے

تراجم کے لیے کتابوں کے انتخاب میں غیر متعصب رویہ اپنایا گیا ہے تراجم کے انتخاب میں خاصا تنوع نظر آتا ہے

کے لیے بھی بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ترجمے انسانیت کے درمیان میل جول کا ذریعہ بھی بن گئے ہیں، لیکن اس کی مشکلات بے شمار ہیں۔ ان مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ ترجمہ نگار کو ان دونوں زبانوں میں ماہر ہونا چاہیے، جس سے وہ ترجمہ کررہے ہیں اور جس زبان میں وہ کریں گے اور تیسری چیز یہ بھی کہی گئی کہ اس مضمون پر بھی عبور حاصل ہونا چاہیے، عبور ایک حد تک۔ لیکن میں اپنی ناچیز رائے میں ذرا سا اضافہ کروں گی کہ مضمون کے ساتھ تمام دنیا کی قوموں اور ملکوں میں جو ایک تہذیبی فرق نظر آتا ہے، ترجمے کو اسے بھی پاٹنا چاہیے کیونکہ اگر مترجم کی نفس مضمون پر تو قدرت ہے لیکن اس ملک، جہاں وہ کتاب لکھی گئی ہے، کو بخوبی نہیں سمجھتا تو وہ ترجمہ میں وہ باتیں اس انداز سے لا نہیں پاتا جس کی اس سے امید کی جاتی ہے۔ لہٰذا تہذیبی مطالعے کی بھی شدید ضرورت ہے۔ عظیم کتابوں کے سلسلے میں میرا تاثر یہ ہے کہ ترجمے کے لیے کتابیں بہت ہی مستند اور وسیع چنی گئی ہیں اور ان کے انتخاب میں بڑا غیر متعصب رویہ اپنایا گیا

ہے۔ دیکھا جائے تو علم دنیا میں ہر جگہ بکھرا ہوا ہے اور ہر زبان میں عظیم کتابیں بھی موجود ہیں۔ آپ کسی ترازو سے یہ نہیں تول سکتے کہ فلاں زبان کی کلاسیک زیادہ اچھی ہے۔ دنیا بھر سے یہ نام چنے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مقتدرہ واقعی مبارک باد کے

پوری دنیا میں جہاں بھی اردو کے فروغ کے لیے کام کام ہورہا ہے اس کو مربوط کرنے کی ضرورت ہے

قابل ہے۔ لیکن میں ایک بات یہ بھی کہوں گی کہ آپ کا ذہن اس طرف بھی جانا چاہیے کہ ادب کی بہت اعلیٰ معیار کی جو تخلیقی کتابیں ہیں ان پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔ اگرچہ میں نے یہ بڑی مشکل بات کی ہے کیونکہ تخلیقی کتابوں کا ترجمہ مشکل ترین ترجمہ ہوتا ہے جبکہ ہم اپنے سائنسی علوم یا معاشرتی علوم کے ترجمے ایک ٹیم بٹھا کر، کرسکتے ہیں اور ان کتابوں کی روح کے قریب بھی پہنچ سکتے ہیں لیکن جب ادب کی بات آجاتی ہے اور خاص طور پر شاعری کی طرف دھیان جائے تو میں یہ بات بھی اس میں شامل کروں گی، عموماً ترجموں میں اصل کی روح مرجاتی ہے۔ مقتدرہ ابھی جو کام کررہا ہے وہ بہت عمدہ کام ہے اس پر پیسہ بھی بہت لگتا ہے۔ مقتدرہ مزید اس کام کو جاری رکھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف بھی توجہ دے۔ ترجمہ نگار نہ صرف پورا مطالعہ کرتا ہے بلکہ اچھی طرح سے مشاہدہ بھی کرتا ہے اور تخلیق کے عمل کو دوبارہ اپنے اوپر طاری کرتا ہے۔ اچھا ترجمہ نگار اگر تخلیقی کاموں کو سامنے لائے گا اور گزری ہوئی واردات کو اپنے اوپر طاری کرنے کی پھر سے کوشش کرے گا تو یقیناً اچھا ترجمہ وجود میں آئے گا۔ ہمارے پاس جوہر قابل کی کمی نہیں۔ جیسے عظیم کتابوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے اگر اسی طرح دوسری طرف بھی توجہ دی جائے تو بہت بہتر ہوگا۔ اگرچہ یہ بات شاید قبل از وقت ہو لیکن میں آپ سب لوگوں کو موجودگی میں کہنا چاہتی ہوں کہ اس کی ابتداء تو کردی جائے۔ تلفظ کے بارے میں انگریزی ناموں کے لیے زیر زبر کا خیال رکھا جائے کیونکہ یہ سوال اکثر اٹھتا ہے کہ انگریزی ناموں کو کیسے لکھا جائے تاکہ پڑھنے میں سہولت ہو۔ آخر میں، میں یہ کہوں گی کہ یہ عظیم کتابیں واقعی ایک عظیم کام ہے اور یہ جاری رہنا چاہیے۔ ہمارا تعاون مقتدرہ کے لیے حاضر ہے۔ اس کام کے لیے مقتدرہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

ڈاکٹر صدیق شبلی:

اردو کا ایک طالب علم ہوں، طالب علم کی حیثیت سے میں یہ عرض کروں گا کہ اتنی مختصر مدت میں اردو کی ثروت میں کبھی اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ ایک سال کے اندر یہ منصوبہ بنایا گیا اور اس عملدر آمد کا آغاز کیا گیا اور پھر سب سے زیادہ

ڈاکٹر صدیق شبلی

کاوش کتابوں کے انتخاب میں کی گئی ہے۔ مختلف اہل الرائے اور پڑھے لکھے لوگوں کو اس میں شریک کیا گیا اور مشاورت کا یہ عمل کافی طویل عرصے پر محیط ہے اور جو آرا موصول ہوئیں ان میں سے ان کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں خاصا تنوع نظر آتا ہے۔ زمانی اعتبار سے دیکھیں تو اکیسویں صدی بھی اس میں شامل ہے اور ماضی بھی اس کے اندر شامل ہے، زوال مغرب جیسی کتاب بھی اس کے اندر موجود ہے اور حالیہ بڑی بڑی طاقتوں کا زوال ایسی کتاب بھی، تو اس اعتبار سے بھی یہ انتخاب بہت اچھا لگتا ہے کہ اس کے اندر ایک جامعیت موجود ہے۔ پھر مضمون کے اعتبار سے دیکھیں تو اس میں تاریخ بھی ہے بلکہ تاریخ کا پہلو زیادہ نظر آتا ہے اور ایسی کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو واقعی آج کے انسان کی آگہی میں اضافہ کرتی ہیں اور اس کو آج کے دور میں زندہ رہنے کا اسلوب سکھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ سائنسی کتابیں جن کی حیثیت علم میں کلاسیک کی ہے، جن کی بڑی دھوم رہی ہے اور جن کو پڑھنے کے لیے لوگ آرزو مند رہے ہیں کہ کاش یہ کتاب ہماری زبان میں ہوتی۔ جیسے زوال مغرب ایک بڑی کتاب ہے، کتاب النفس، معاہدہ عمرانی، خارجی دنیا کا علم یا بوطیقا ہے، ارسطو سے شروع کرتے ہوئے پال کینیڈی تک آپہنچے ہیں۔ ترجمہ کسی بھی زبان میں ہو آسان کام نہیں۔

ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے ان دقتوں، مشکلات اور مسائل کی بجا طور پر نشاندہی کی ہے اس میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ دو باتوں کی طرف میں توجہ دلانا چاہوں گا، پہلی بات کی طرف بیگم ثاقبہ رحیم الدین صاحبہ نے بھی اشارہ کیا وہ ہے ادبی کتاب، اس سلسلے میں عربی، فارسی یا انگریزی یا جرمن زبان کی ایک آدھ ادب کی کتاب اگر قدیم

اردو اب ایک بین الاقوامی زبان ہے ترجمہ انسانیت کے درمیان میل جول کا ذریعہ بن گیا ہے

زمانے کی شامل ہوجائے تو مناسب ہوگا۔ انسان کے ذہن کو یا اپنے تاریخی تسلسل کو ان کتابوں کے ذریعے سے برقرار رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھیے کہ آج کے انسان یا پرانے زمانے کے انسان کو ادب نے کس طرح سے پیش کیا ہے۔ معاہدہ عمرانی کس

طرح پیش ہوا۔ اکیسویں صدی میں انسان اس طرح سے آیا کہ روبوٹ نے جو خطرہ اس کے لیے پیدا کیا یا ٹیکنالوجی یا ماحولیات سے مل کر انسان کے لیے جو دنیا تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ تبدیلیوں کا ایک چیلنج ہے۔ یہ علمی لوگوں کا تجزیہ ہے ادب والے بھی اس کو دیکھتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ممکن ہے فارسی کسی اگلے پروگرام میں شامل ہو، فارسی کی کتابوں کا اضافہ ہونا چاہیے۔ عربی تو اس میں شامل ہے۔

آخر بات یہ عرض کروں گا کہ اردو جملہ آج سے سو سال پہلے جو تھا وہ آج نہیں ہے۔ اردو کا جملہ اکھرے بدن کا ہے۔ اردو کو اپنی توانائی میں اضافہ کرنے کے لیے چار پانچ جملوں کا بوجھ برداشت کرنا پڑے گا اور اردو کا جملہ اس ذمہ داری کو قبول کر رہا ہے۔

محمد میاں صدیقی:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف عظیم کتابیں ہی نہیں عظیم کام بھی ہے جو مقتدرہ نے سر انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے بہت فنی نوعیت کی باتیں کی ہیں۔ ان کی ایک بات سے میں تھوڑا سا اختلاف کروں گا اور اس کی وضاحت بھی وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے جو بعض جملوں کی مثالیں دی ہیں کہ ترجمے کے بعد مصنف کی پوری مراد واضح نہیں ہوتی ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ بعض کتابیں جیسے کتاب النفس اتنی فنی ہوتی ہیں اور ان کے اندر اتنی اصطلاحات ہوتی ہیں کہ مصنف سوچتا رہ جاتا ہے کہ ان کو اپنی زبان میں کیسے منتقل کرے اور وہ ان کے اسلوب میں تبدیلی بھی نہیں کر سکتا یعنی اس کے سامنے یہ بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ اگر ترجمے کا اسلوب بدلا گیا تو لوگ اعتراض کریں گے۔ تذکرے یا تاریخ کی کتاب میں مترجم کے لیے گنجائش ہوتی ہے لیکن فنی نوعیت کی کتابوں میں یہ گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بھی نہیں کہ

اردو میں جملے کی ترکیب سادہ ہے جبکہ دوسری زبانوں میں پیچیدہ ہے

اجمال و اختصار کے باوجود قاری اس کو نہیں سمجھ سکتا، البتہ میں یہ کہوں گا کہ ترجمے میں جو اصطلاحات آتی ہیں یا جن افراد کے نام آتے ہیں اس میں، اصل کتاب میں، متن کے اندر، تو اس کی زیادہ تفصیلات نہ سہی فہرست کی صورت میں یا حواشی کی صورت میں اس کی تھوڑی سی وضاحت کر دینی چاہیے۔ ایک بات اور کہ اگر کچھ عظیم کتابیں، جو دین اسلام کے بارے میں ہیں' اس سلسلے میں نہیں بھی شامل کرنا چاہیے اگر ماہرین کی کمیٹی بنا کر اس طرح کی کچھ کتابوں کا انتخاب کر لیا جائے جو ہر فن، ہر موضوع پر مختلف صدیوں، مختلف مسلم علماء نے لکھی ہیں ان کے تراجم کرائے جائیں تو بہتر رہے گا۔ کچھ کتابوں کے تراجم تو ہو چکے ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے سرے سے ان کے تراجم کر کے انھیں نئی تدوین کے ساتھ پیش کیا جائے۔ جیسے مقدمہ ابن خلدون وغیرہ اور

محمد میاں صدیقی

اصطلاحات کی توضیح حواشی میں ہونی چاہیے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکے کیونکہ ان تراجم کی زبان بھی اب سو سال پرانی ہو چکی ہے۔ اسی طرح کی بے شمار کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر عطش درانی:

جہاں تک فہرست سازی کا تعلق تھا مقتدرہ نے کوشش کی کہ جتنی عظیم کتب ہیں ان کی فہرست بنائی جائے اور جو کام ہمدرد کونسل کر رہی ہے وہ بھی اس میں شامل ہو۔ ان سب کو سامنے رکھ کر تقریباً ساڑھے تین چار سو کتابوں کی فہرست بنائی گئی تھی پھر بہترین اور کم تر کتابوں کے بارے میں اہل علم سے رائے لی گئی اور سب سے مشورہ کر لینے کے بعد جامعات اور علمی اداروں، اہل

> بعض کتابوں کے نئے سرے سے تراجم کر کے نئی تدوین کے ساتھ پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے

علم کو رینڈم سیمپلنگ کے ذریعے فہرستیں بھیجی گئیں اور رائے مانگی گئی کہ آپ کے خیال میں پہلی قسط کے لیے دس کتابیں کون سی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ان سب اہل علم سے جب آراء موصول ہوئیں تو باقاعدہ شماریاتی طریقے سے ان کتابوں کے جوابات مرتب کیے گئے۔ اسپنگلر کی زوال مغرب پہلے نمبر پر، فرائیڈ کی سائیکو اینالیسز دوسرے نمبر پر رہی۔ اس طرح سے ہم نے ترجیحی فہرست بنائی اب اس ترجیحی فہرست میں بھی کاٹ چھانٹ کی گئی کہ فلاں کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں ان کو الگ رکھ لیتے ہیں یا ان ترجمہ شدہ کتابوں کا دس فیصد لے لیتے ہیں۔ اس میں جیسا کہ ہماری معاہدہ عمرانی آ گئی اس طرح سے سائنسی طریقے سے فہرست بنائی گئی تاکہ کسی کی ذاتی رائے اس میں کم سے کم شامل ہو اور اہل علم کی رائے کا ایک شماریاتی مجموعہ ہمارے پاس جمع ہو جائے۔ چنانچہ جو فہرست ترجیحی طور پر مرتب

لمبے جملوں کو ترجمہ کرتے وقت توڑ دینا چاہیے

ہوئی اس میں سے کوشش کی گئی کہ پہلی کتابوں میں سے کچھ جلد چھپ کر آجائیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ان میں سے اب تک ہم دس کتابیں پیش کر چکے ہیں ان کے علاوہ کچھ پریس میں ہیں اور کچھ ترجمہ ہورہی ہیں جیسے چین اور جاپانی کتابوں کے تراجم کا ذکر بھی ہوا تھا، اس فہرست میں چین اور جاپان کی کتابیں بھی ہیں مثلاً بدھ مت اور دوسرے مذاہب کی کتب۔ اسی طرح مشرق ومغرب، شمال وجنوب سب کو اس میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جہاں تک ادبی موضوعات کا تعلق ہے، جیسا کہ بوطیقا یا رطوریقا ہے یہ ارسطو کی کتابیں ہیں جو کسی حد تک ادبیات میں شامل ہیں۔ ان میں سے بوطیقا شائع ہوچکی ہے اور رطوریقا آرہی ہے۔ ڈیوائن

> جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے، جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے اور جس مضمون کو ترجمہ کیا جارہا ہے ان تینوں پر مکمل عبور کے بغیر ترجمہ ممکن نہیں ہوتا

کامیڈی یا ایسی دیگر عظیم ادبی کتب جن کی بنیاد فکر وفلسفہ پر بھی ہے انھیں شامل کرنا بھی مقصود ہے۔ پھر مقتدرہ کے پیش نظر وہ پانچ ہزار پہلے سے شائع شدہ تراجم بھی ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں۔ مقتدرہ نے ایک کتابیات تراجم بھی شائع کی ہے جس میں ایسے تراجم کا ذکر موجود ہے۔ یوں اس سارے کاموں سے گزر کر ایک فہرست مرتب کی گئی۔ مقتدرہ نے اپنے وسائل ہی سے ایسا انتظام کیا ہے کہ ان پچاس کتابوں کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

حواشی اور فہرست کے حوالے سے جو بات کی گئی ہے اسے کتابوں کی آئندہ اشاعت میں مد نظر رکھا جائے گا، جب ہم ان کتابوں کو ایک مکمل تعلیمی سیٹ کے طور پر پیش کریں گے۔ ہم یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ اس سیٹ کو قیمت کے لحاظ سے بھی عوام کے لیے سستا پیش کیا جائے ایک اور بات جو اصل بنیاد ہے اور وہ یہ کہ ان کتابوں کی اشاعت سے اردو تحریر و نگارش کے مروج اسالیب میں اضافہ ہوسکے۔ ان کتابوں کے ترجمے سے بہت بڑا فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ ہم اردو کے مختلف مضامین میں جیسے طبیعیات، فلسفے، تاریخ، عمرانیات، تکنیکی علوم وغیرہ میں یقیناً اردو کے اسالیب بیان کو آگے بڑھا سکیں گے۔

باقر نسیم:

مذاکرے کے شرکاء کی گفتگو کے پیش نظر امید ہے کہ ہماری آئندہ کوشش رہے گی کہ ہم اپنے آنے والے پروگراموں کو بہتر سے بہتر بنائیں اور آئندہ جو کتابیں ہم شائع کریں گے انشاء اللہ ان سب باتوں کا خیال رکھا جائے گا اور جن قیمتی آرا سے آپ نے ہمیں نوازا اس میں فروخت کتب اور تراجم کے مسائل کے بارے میں ان سب کو ہم پیش نظر رکھیں گے۔ میں مذاکرے میں شریک صاحبان علم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر اس گفتگو میں شرکت فرمائی۔

عظیم کتب کے تراجم .... تاثرات

------ آپ نے علم و حکمت کے قدیم خزانے کو اردو زبان میں منتقل کرنے اور جامۂ زیبا پہنانے کا قابل قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مقتدرہ قومی زبان آپ کی سربراہی میں علم و دانش کی توسیع اور اردو زبان کے علمی خزانے کو مزید وقیع بنانے کی مستحسن کاوشیں جاری رکھے گا۔

محمد رفیق تارڑ
(صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان)

○

یہ جان کو خوشی ہوئی کہ مقتدرہ قومی زبان اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے کوشاں ہے اور اپنی تمامتر مشکلات اور وسائل کی کمی کے باوجود اس نے اس سلسلے میں اہم کتابوں کے اردو تراجم کا کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آپ کے ادارے کی کوششوں کو میں سراہتا ہوں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے آپ مجھے ہر ممکن تعاون اور مدد کے لیے تیار پائیں گے۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر
(گورنر سندھ)

○

ماشاء اللہ۔ بہت کم لوگ اتنی اچھی کتابیں منتخب کرسکتے ہیں اور بہت کم لوگ اتنا اچھا ترجمہ کرسکتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ کیسے اتنی اچھی کتابیں اور اتنے پڑھے لکھے لوگ نکال لاتے ہیں؟ اردو پڑھنے والوں کی طرف سے اس انتخاب کا اور میری طرف سے اس عنایت کا شکریہ قبول فرمائیں۔

پروفیسر سید محمد تقویم الحق کاکاخیل
(تمغۂ امتیاز)

○

کتابوں کا انتخاب بہت ہی متنوع، دلچسپ اور فکر انگیز ہے اور مجھے ایسے شاہکار اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے، لہٰذا آپ کو مبارکباد دینی چاہیے یہ اردو کی زبردست خدمت ہے جس پر آپ تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔

ایس بابر علی، لاہور

ماہنامہ
اسلام آباد

اخبارِ اردو

مقتدرہ قومی زبان
دسمبر ۱۹۹۹ء

م اور سنت نبوی ﷺ

اردو یونیورسٹی کا قیام

امت کی شاعری کا منبع ہے

قائداعظم کے خواب کی تکمیل ہے

عطش درانی

فنِ ترجمہ: اصول و مبادی

(ترجمے کے تکنیکی اصولوں کا بیان)

فنِ ترجمہ وہ واحد میدان ہے، جسے آج تک نظری اور اصولی پہلوؤں سے نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے ہاں ترجمے کی تاریخ ان کے تہذیبی اور سیاسی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔ یونانی اور سریانی سے عربی اور پھر فارسی ترجمے کی رفتار اسلام کے ابتدائی عہد میں خاصی تیز رہی ہے۔ پھر یہ رفتار اگلے پانچ سو برس تک سیاسی وجوہ کی بنا پر سست پڑ گئی۔ اب پھر پچھلے دو تین سو برس سے خصوصاً موجودہ صدی میں فنِ ترجمہ عروج پر ہے اور آج یہ ایک بنیادی علمی ضرورت بن گیا ہے۔

عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اردو میں فنِ ترجمہ کا علمی اور نظری جائزہ لیا جائے اور اس کے تکنیکی اصولوں کو مبسوط انداز میں پیش کیا جائے چنانچہ اس علمی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فنِ ترجمہ کے اصول و مبادی کا خاکہ تجویز کیا جا رہا ہے۔

فنِ ترجمہ کے میدان میں ہاشمی فرید آبادی نے بنیادی طور پر اس کے نظری پہلو پر قلم اٹھایا۔ ڈاکٹر لائٹنر، مولوی عبدالحق، مولوی وحیدالدین سلیم، عبدالمجید سالک، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر مسکین علی حجازی، حاجی احمد فخری، ڈاکٹر جمیل جالبی، جیلانی کامران، انیس ناگی، ظ انصاری، ممتاز حسین، ڈاکٹر سہیل احمد خان، سید باقر حسین اور سید عابد علی عابد نے بھی فنِ ترجمہ کے اصولوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ ضمنی طور پر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، حامد حسن قادری، ڈاکٹر گیان چند، ابنِ حنیف، میرا جی، عبدالرشید فاضل، عبدالرحمٰن طارق، رفیق خاور، ایس اے رحمان، گل بادشاہ، ظفر احمد صدیقی، مولوی میر حسن، حسن الدین احمد، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، صوفی تبسم، محمد حسن عسکری، امجد اسلام امجد، اور ممتاز حسین نے بھی قلم اٹھایا ہے۔

فنِ ترجمہ کے بارے میں پہلی بات تو یہ تسلیم کر لینی چاہیے کہ کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں وہ ترجمہ ممکن نہیں جسے ہم عرفِ عام میں ممکن سمجھتے ہیں۔ ایڈورڈ وی بشن تاریخ زبان انگریزی میں لکھتے ہیں کہ کسی فن پارے یا ادبی تخلیق کے مافیہ کو ترجمے کے ذریعے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج، اپنا آہنگ اور اسلوب و پیرایہ بیان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں روزمرہ، تشبیہات، محاورات، ضرب الامثال، استعارات و کنایات، مخصوص معاشرتی، معاشی، تاریخی اور سیاسی زندگی کی نمائندگی اور تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔

سید عابد علی عابد نے بھی "اصول انتقادِ ادبیات" میں یہی لکھا ہے کہ کسی بھی لفظ کا مفہوم کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے باوجود کہ کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ممکن نہیں ہے تراجم کا ایک انبار لگتا چلا جا رہا ہے ترجمے کی ان کاوشوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اسلوب اور معانی کا ترجمہ ممکن نہیں مگر مفہوم اور مطلب کو دوسری زبان میں بیان کرنا بالکل ممکن ہے بقول مولوی عبدالحق "یہ کام اس سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں زور اور جسے زبان پر قدرت ہو" صاف ظاہر ہے کہ ترجمہ محض متبادل اور مترادف لفظ کے استعمال کا نام نہیں بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اپنی زبان میں نہ جاننے والے افراد کے لیے کسی دوسری زبان کی نگارشات کے مطلب اور مفہوم کو بیان کر دیا جائے اور اپنی زبان کے اسلوب و پیرائے میں اس کی نوع ہے گویا ترجمہ ایک تخلیقی بازیافت کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیق ہوتا ہے اور کوئی شخص اگر اصل کو پڑھ لے تو ترجمے کو پڑھتے ہوئے بھی اسے وہی زور بیان اور فصاحت و بلاغت ملے جو اصل میں موجود تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اچھے ترجمہ اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں دینا چاہیے تو ہم اسے ترجمہ ہی کیوں کہیں، تخلیق کیوں نہ قرار دیں اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ مترجم کسی دوسرے کی تخلیق کی بازیافت کرتا ہے وہ نہ تو اس میں تبدیلی کرتا ہے، نہ ترمیم نہ اضافہ، نہ کردار تخلیق کرتا ہے اور نہ پلاٹ، خاکے یا منصوبے میں کوئی رد و بدل کرتا ہے یوں اس کا ترجمہ بہرحال ترجمہ ہی رہے گا خواہ وہ تخلیق کے کتنا ہی قریب ہو۔

جدید دور میں فن ترجمہ نہ صرف صحافتی، ادبی اور علمی ضرورت ہے بلکہ تیزی سے بڑھتی ہوئی سائنسی دنیا اور روز افزوں ٹیکنالوجی خصوصاً کمپیوٹر سائنس میں بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے باوجود ترجمے کا تعلق لسانیات اور اسلوب کے میدانوں سے ہے۔ چنانچہ جب ہم ترجمے کے اصول و مبادی کا ذکر کریں گے تو لسانیاتی مسائل اور اسلوب کے انداز پر مباحث کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ زیر نظر سطروں میں ہم قواعد زبان اور اسلوب بیان کے عمومی اصولوں کو زیر بحث تو نہیں لائیں گے البتہ ایسے تکنیکی پہلوؤں اور فنی مہارت کے اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے جہاں کہیں صرف و نحو اور بیان کو زیر بحث لانا ہوگا، ان سے صرف نظر نہیں کیا جائے گا۔

جہاں تک ترجمے کی تعریف کا تعلق ہے اسے ہم ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ ترجمہ کسی زبان پر کیے گئے ایسے عمل کا نام ہے جس میں کسی اور زبان کے متن کی جگہ دوسری زبان کا متبادل متن پیش کیا جائے۔ اس تعریف میں معانی، مفہوم، مطلب، انداز بیان اور اظہار بیان اسلوب اور انداز کے تمام پہلو آ جاتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر یہ فن زبان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کے نظری پہلو کو ہم ترجمے کا لسانیاتی نظریہ قرار دے سکتے ہیں۔

لسانیاتی نظریات اس بات سے بحث کرتے ہیں کہ زبانیں کیونکر کام کرتی ہیں۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر ایک سائنسی نظریہ ہے جو زبانوں کے بارے میں ہمارے مطالب اور مشاہدات کو عمومیت بخشتا ہے۔ دنیا کی زیادہ تر زبانیں عام طور پر اس نظریے پر شاہد ہیں۔ چند زبانیں مثلاً چینی یا جاپانی ایسی بھی ہیں جو اس بنیادی لسانی نظریے سے انحراف کرتی ہیں یہ لسانی نظریہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر ایم اے کے ہالی ڈے نے پیش کیا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ہالی ڈے اور پروفیسر فرتھ کے نظریات کو عمومی طور پر اپنی بحث کی بنیاد بنائیں گے تاہم جہاں تک ترجمے کی افقی اور عمودی سطحوں کا تعلق ہے ہم نے ان سے اختلاف اور انحراف بھی کیا ہے۔

پاکستان میں ترجمے کی ضرورت اس علمی ضرورت سے چنداں مختلف نہیں جو جدید علمی اور صحافتی دنیا کو درپیش ہے، علمی ادبی اور صحافتی ضرورت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں اس فن کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ سرکاری، دفتری، عدلیہ اور مقننہ میں جس قدر جلد ممکن ہو غیر ملکی زبان سے پیچھا چھڑایا جا سکے۔ دفتری اور سرکاری امور اپنی قومی زبان میں انجام دیے جا سکیں۔ پاکستان میں "انجمن ترقی اردو"، "سائنٹیفک سوسائٹی"، "زرعی یونیورسٹی فیصل آباد"، "ترقی اردو بورڈ"، "اردو لغت بورڈ"، "مجلس ترقی ادب"، "مرکزی اردو بورڈ (اردو سائنس بورڈ)"، "مجلس زبان دفتری پنجاب"، "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی"، "اردو اکیڈمی لاہور"، "اسلامی نظریاتی کونسل"، "وزارت قانون"، "ادارہ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب"

"شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی"، "ہمدرد فاؤنڈیشن" اور "مقتدرہ قومی زبان"، سرکاری اور نیم سرکاری اور نجی سطح پر ترجمے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان بھر کے اردو اخبارات صحافتی ترجمے کو اپنی ضرورت کے پیش نظر فروغ دے رہے ہیں۔ اور ادیب بھی مختلف ادبی کاوشوں، خصوصاً شاعری، افسانے، ڈرامے کی اصناف میں خاطر خواہ ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں تاہم اس ضمن میں اخباروں کے خصوصی ایڈیشنوں، ادبی رسالوں اور ڈائجسٹوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ہزاروں، لاکھوں، مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھال چکے ہیں۔

مگر ان سب کاوشوں میں ایک بات خلط ملط ہو کر رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ ترجمے کو اس کے تکنیکی اصولوں کے ساتھ صحیح طور بہت کم برتا گیا ہے۔ اردو میں متناسب اور خوبصورت ترجمے کی مثال ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب "معرکہ مذہب سائنس" ہے، جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ اس میں ترجمے کی سطح اور تکنیک کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔ جب ہم ترجمہ کی سطح کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ انسان کی سماجی صورت حال اس سطح کے ساتھ کیونکر نسبت رکھتی ہے؟ یہ نسبت زبان کی مختلف سطحوں کی درجہ بندی کو ظاہر کرتی ہے اس کو ہم لسانیاتی تجزیہ بھی کہتے ہیں آگے چل کر یہ تجزیہ قواعد اور صوتیات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ زبان ایک نفسیاتی کردار یا طرز عمل ہے اور یہ انسان کا سب سے بنیادی اور اہم کردار ہے۔ سوچ سے اظہار تک کئی پیچیدہ نفسیاتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اظہار کا تعلق ہے یہ دو صورتیں اختیار کرتا ہے۔ ایک آواز کی صورت اور دوسری جسمی حرکات کی صورت۔ آواز کی صورت کو ہم صوتی یا تقریری اظہار کا نام اور جسمی حرکات کی صورت کو اشاراتی یا تحریری صورت کا نام دیتے ہیں۔ آگے چل کر ترجمے کے اس پہلو یعنی لسانیاتی تجزیے سے ہم تکنیکی امور کے جائزے کا آغاز کریں گے۔

لسانیاتی نظریے کی رو سے فن ترجمہ تقابلی لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ دنیا کی کسی بھی دو زبانوں کے درمیان ترجمے کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ کسی لسانی رشتے سے وابستہ ہوں یا انتہائی غیر متعلق ہو۔ زبانوں کے درمیان یہ تقابلی مطالعہ ان میں یکسانیت تلاش کرنا نہیں ہوتا بلکہ دو طرفہ تبدیلیٔ مفہوم یا دوسرے لفظوں میں ان میں ترجمہ پذیری کا جائزہ لینا مقصود ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تقابلی لسانیات فن ترجمہ سے ہم آہنگ علم ہے۔ لیکن فن ترجمہ یکطرفہ کارروائی کا نام ہے اس میں ہمیشہ ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف چلتے ہیں۔ جس زبان کے متن کا ترجمہ مقصود ہوتا ہے۔ اگر ہم اسے ماخذ کا نام دے لیں اور جس زبان میں ترجمہ مقصود ہوتا ہے اسے ہم ترجمے کی زبان قرار دے دیں تو اس لحاظ سے ترجمے کی تعریف یوں بنے گی۔ کسی ایک زبان (ماخذ) کے متن کے متبادل کے طور پر دوسری زبان (ترجمہ) کا متن پیش کرنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ اس تعریف میں "متن اور متبادل" کے دو الفاظ اصطلاحی معانی میں آئے ہیں۔ ترجمے کی تکنیک متون کے مطالعے اور متبادلات کی اسی پیشکش کا نام ہے۔ اس پیشکش میں کئی سطحیں درپیش ہوتی ہیں۔ بعض سطحوں میں سیدھا سادا متبادل لفظ پیش کر دینا ہی ترجمے کا کام دے دیتا ہے۔ مثلاً This is a Book کا متبادل "یہ ہے ایک کتاب" بنتا ہے۔ ترجمے کی صورت میں ہم اپنی زبان کے قواعد کی رو سے اسے یوں لکھیں گے۔ "یہ ایک کتاب ہے"۔ اس میں محض لفظی معانی کو بطور متبادل رکھ دیا گیا ہے۔ مگر اکثر صورتوں میں یہ سادگی ممکن نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں ہمیں بعض اوقات محض مفہوم کا ترجمہ پیش کرنا ہوتا ہے یا کچھ حصے کا لفظی ترجمہ اور کچھ حصے کا مفہوم۔ ترجمے کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ ہم وہ متبادل تلاش کر سکیں جو کسی متن کے لیے درکار ہے۔ گویا ہمیں متبادل اور مترادف کی فطری حدود کا علم فن ترجمہ میں بنیادی طور پر درکار ہوتا ہے اس سے پہلے کہ ہم ان کا جائزہ لیں۔ مختصراً ترجمے کی اقسام، ان کی حدود، سطح اور درجہ بندی کے لحاظ سے بیان ہو جائے۔

فنی سطح پر ترجمے کی عام طور پر تین اقسام کی جاتی ہیں (۱) علمی ترجمہ (۲) ادبی ترجمہ (۳) صحافتی ترجمہ، یہ تمام اقسام عمومی طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں (۱) کلی اور جزوی ترجمہ اس کی آگے مزید دو اقسام ہیں (ا) لفظی ترجمہ (ب) بامحاورہ ترجمہ (۲) تحدیدی ترجمہ۔ اس کی علاوہ بھی چار اقسام ہوتی ہیں۔ (ا) صوتیاتی ترجمہ (ب) ترسیمی ترجمہ (ج)

فعلی متبادلہ (۵) لسانیاتی ترجمہ ان اقسام کا جائزہ دیتے ہوئے ہمیں ان امور کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ ترجمہ پذیری کی حدود کیا ہیں۔ کون سی چیز قابل ترجمہ ہے اور کس حد تک وہ ترجمہ ہو سکتی ہے۔ جہاں تک ترجمے کی حدود کا تعلق ہے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا کسی متن کا پورا ترجمہ درکار ہے، جس میں متن کے ہر حصے کا متبادل پیش کیا جائے یا اس کا جزوی ترجمہ درکار ہے جس میں بعض حصے ترجمے کے بغیر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ پورے ترجمے میں متن کو زیادہ تر زیر مشق بنایا جاتا ہے، جب کہ جزوی ترجمے میں ادبی متن کو عام طور پر اسی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ لسانیاتی طور پر کلی اور جزوی ترجمے میں صرف کچھ تکنیکی امتیاز کیا جاتا ہے۔ ماخذ میں بعض الفاظ اور جملوں کی تحدید کر لی جاتی ہے یعنی پہلے سے اس بات کا تعین کر لیا جاتا ہے کہ فلاں حصہ ترجمے کے لیے ممنوع ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ "سو فیصد کلی ترجمہ ممکن ہی نہیں" اور جسے ہم "کلی ترجمہ" کہتے ہیں دراصل "کلی متبادل" کہنا چاہیے۔ ورنہ ترجمے کی تمام سطحوں پر جب ہم کلی مترادف پیش نہیں کر سکتے تو ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہم صرف مترادف یا متبادل کو استعمال میں لاتے ہیں، ترجمہ کرتے ہیں اور اس کو ہم کلی ترجمہ کہتے ہیں اس کلی ترجمے میں ہم الفاظ کے بدلے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اور جملوں کے بدلے میں جملے، صوتیات کے بدلے میں صوتیات اور ترسیمیات کے بدلے میں ترسیمیات۔ لیکن عام طور پر ہم مرادف کی سطح پر ترجمہ نہیں کر پاتے۔ یہ بات ہم آگے چل کر الفاظ و معانی اور مترادف و مرادف کی بحث میں پیش کریں گے۔ یہاں ہم کلی ترجمے کی تعریف کچھ یوں کریں گے۔ کلی ترجمے سے مراد ماخذ کو قواعد اور لغوی طور پر اس کے صوتیات اور ترسیمیات کی سطح پر متبادل او مترادفات پیش کرنا ہے۔ اس کے مقابلے میں تحدیدی ترجمے کی تعریف ہم یوں کریں گے کہ ماخذ کے متن کا متبادل ترجمہ کسی ایک سطح پر پیش کرنا یعنی صوتیاتی یا ترسیماتی سطح میں سے کسی ایک سطح پر ترجمہ کرنا۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ لغوی طور پر صوتیاتی اور ترسیماتی ترجمہ ممکن ہے مگر ایسا سیاقی ترجمہ ممکن نہیں جو لغت اور قواعد کی سطح سے ہٹ کر سیاق و سباق کے مطابق مترادفات پیش کرنے کی صورت میں ہو۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نحوی ترجمہ ممکن نہیں۔

صوتیاتی ترجمہ" ماخذ کی صوتیات کے مترادف کے پیش کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ صورت حال عام طور پر شاعری، ڈراما اور کسی حد تک افسانوں کے ترجموں میں پیش آتی ہے، جہاں آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور حروف کی آوازوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

ترسیمی ترجمہ بھی صوتیاتی ترجمے سے مختلف نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ جس میں علامتیں اور الفاظ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے ترجمہ کیے جاتے ہیں۔ ترسیمی ترجمے کو فعلی مبادلہ سے قطعی مختلف سمجھنا چاہیے

ترجموں کی حدود کا تعین کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ہے یا جملہ بہ جملہ، محاورہ بہ محاورہ یا کوئی اور صورت۔ ہو سکتا ہے کہ کلی ترجمہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہو، جملہ بہ جملہ ترجمہ ہو، بامحاورہ ترجمہ ہو یا کوئی اور صورت۔ ترجمے کی ایک صورت کھلا ترجمہ بھی کہلاتی ہے۔ اس میں کبھی تو لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا جاتا ہے اور کبھی محض ایک بیان کا مفہوم دوسری زبان میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ بامحاورہ یا ادبی ترجمہ ان دونوں ترجموں کے درمیان ہوتا ہے۔ یا لفظ بہ لفظ ترجمے سے ذرا ہٹ کر مگر کھلے ترجمے کی نسبت محدود اور بامحاورہ ترجمہ ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی کے اس جملے کا ترجمہ یوں ہوگا۔

(IT'S RAINING CATS AND DOGS)

(۱) لفظ بہ لفظ ترجمہ: "یہاں کتے اور بلیاں برس رہے ہیں"

(۲) بامحاورہ ترجمہ۔ "موسلا دھار بارش ہو رہی ہے": "بھادوں برس رہے ہیں"

(۳) کھلا ترجمہ۔ بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔

اس طرح ایک اور مثال پیش کی جاتی۔

(GOD WITH THEM)

(۱) لفظ بہ لفظ ترجمہ۔ "خدا ان کے ساتھ"

(۲) بامحاورہ ترجمہ۔ "خدا ان کے ساتھ ہے۔"

(۳) کھلا ترجمہ۔ "بے جھجک / بے شک"

افقی طور پر ترجمے کی اقسام میں سب سے پہلی قسم علمی ترجمے کی ہے، اسے لفظی ترجمہ بھی کہا جا سکتا ہے اور بعض اوقات محدود ترجمہ۔ مفہوم کا ترجمہ بھی درکار ہوتا ہے۔ کلی ترجمہ بھی اسی کی ذیل میں آتا ہے اور جزوی ترجمہ بھی۔ دوسری صورتوں میں سے ترجمے کی یہ قسم عام طور پر علمی امور، مسائل، علامتوں اور کلیوں کے ترجمے میں استعمال ہوتا ہے تمام علمی تحریریں سائنس، جغرافیہ، تاریخ، ریاضی، سماجی علوم، قانون، انجینئری، طب، زراعت وغیرہ اسی کی حدود میں آتے ہیں۔ اسے ہم اصطلاحی یا پیمانہ ترجمے کا نام بھی دے سکتے ہیں، کیونکہ یہ لفظ کے اصطلاحی مفہوم کا ترجمہ کرنے کا نام ہے۔ علمی ترجمے میں ضروری ہے کہ اس کی علمیت اور مطالب کی یکسانیت برقرار رہے اور ہر علمی امر کا ترجمہ اسی علمی میدان کے مطابق کیا جائے۔ مثلاً ثقافت کا لفظ ادبیات میں اور معانی دیتا ہے اور زراعت میں اور معانی دیتا ہے، عمرانیات میں اس کا مفہوم اور ہے اور فنون میں کچھ اور۔ اس لیے علمی ترجمے میں ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

افقی ترجمے کی دوسری قسم ادبی ترجمے ہے۔ اسے ہم بامحاورہ ترجمہ بھی کہتے ہیں، صوتیاتی ترجمہ کی قسم اسی میں استعمال ہوتی ہے۔

تیسری قسم کا ترجمہ کھلے ترجمہ کی زد میں آتا ہے۔ اسے ہم صحافتی ترجمہ کہتے ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی لفظی اصطلاحی ترجمے کی شرائط عائد کی جاتی ہیں لیکن اظہارِ مطلب اس کا مدعا ہوتا ہے۔ سادگی اور اختصار کے پیشِ نظر صحافتی ترجمے کا مطلب سلیس انداز سے مفہوم کو پیش کر دینا ہوتا ہے۔

اس سب کے باوجود یہاں ایک امر بیان کر دینا ضروری ہوگا کہ اگرچہ ترجمہ کی تکنیک جان لینا زیادہ مشکل کام نہیں مگر ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اختصار کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ترجمے کے لیے تین باتیں ضروری ہیں۔

(۱) وہ ماخذ اور ترجمے کی زبانوں دونوں پر مکمل عبور (علمی و تحریری) رکھتا ہو۔

(۲) مضمون اور علم و ادب کی اس شاخ کی مبادیات سے واقف ہو جس کا ترجمہ مقصود ہے۔

(۳) فنِ ترجمہ کی تکنیک سے بخوبی واقف ہو اور اس سلسلے میں صاحبِ اسلوب ہو۔

ان میں سے آخری امر یعنی فنِ ترجمہ سے واقفیت اور صاحبِ اسلوب ہونا بنیادی اور کڑی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمے کے انباروں کے باوجود بہت کم ترجمے فنی اور تکنیکی معیار کو پہنچتے ہیں۔

فنِ ترجمہ

"ترجمہ ایک باقاعدہ اور مستقل فن ہے۔ ترجمے کے فن میں مہارت اور قدرت پیدا کرنے کے لیے اور دوسرے ہنروں کی طرح شوق اور صلاحیت کے ساتھ تربیت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمہ محنت طلب کام ہے۔ ایک طرف وہ سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس فن کے اصولوں سے واقفیت بھی لازم ہے۔

اس فن کو برتنے اور اس میں مہارتِ تامہ پیدا کرنے کے لیے کم سے کم دو زبانوں کی ساخت اور ان کی ادبیات سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک طرف وہ زبان یا زبانیں جن سے ترجمہ کرنا مقصود ہو اور دوسری طرف وہ زبان جس میں ترجمہ کرنا ہو۔ دونوں زبانوں کے مزاج کو پہچاننا بھی لازم ہے۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو اس سے صرف واقفیت ہی کافی نہیں ہے۔ اس زبان کی لغت، اصطلاحات، محاوروں اور خاص طور پر مترادفات پر ماہرانہ عبور از بس ضروری ہے۔"

حسن الدین احمد

سازِ مغرب (اردو انتخاب میں)، حصہ دوم، ص: ۲

ماہنامہ

اخبار اردو

اسلام آباد

جلد ۲ — جنوری ۱۹۸۵ء — شمارہ : ۱

اس شمارے کے اہم مضامین

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

اختر راہی
نائب مدیر اعزازی

اردو ترجمے کی فنی تاریخ

عام طور پر یہی تصور کیا جاتا ہے اردو میں سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب ملا وجہی کی "سب رس" تھی جو ۱۶۳۵ء میں وجود میں آئی۔ گویا اردو میں نثری تراجم کا آغاز ۱۶۳۵ء سے ہوتا ہے۔ یہ ادبی نوعیت کا ترجمہ تھا جو بامحاورہ بلکہ ایک حد تک تخلیقی ترجمہ تھا اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے۔ "سب رس" کے محاسن و معائب پر نقادوں نے اس قدر لکھا ہے کہ ان کی مجموعی رائے اس کتاب کو ایک تخلیقی شہ پارہ ہی قرار دیتی ہے اس کے علاوہ شمالی ہند میں جو دیگر تراجم ہوئے وہ زیادہ تر تصوف سے تعلق رکھتے ہیں میراں یعقوب نے "شمائل الاتقیا" مصنفہ رکن عماد الدین دبیر کا اردو ترجمہ ۱۷۴۳ء میں مکمل کیا تھا۔

شمالی ہند میں ترجمے کا دوسرا کام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کا "ترجمہ قرآن مجید" ہے جو انہوں نے ۱۷۷۶ء کے قریب کیا۔ یہ ترجمہ لفظی تھا اور اسی لیے دشوار اور ناقابل فہم قرار دیا گیا۔ لفظی ترجمے کی ان خرابیوں کا کچھ تذکرہ پیچھے آچکا ہے۔ ۱۷۹۰ء میں شاہ عبدالقادر نے "قرآن مجید" کا ترجمہ پیش کیا وہ قدرے واضح اور نسبتاً سہل ادائیگی کا نمونہ پیش کرتا ہے مگر اس سلاست کے باوجود اسے بھی ہم بامحاورہ ترجمہ قرار نہیں دے سکتے دکن میں بھی تصوف کے موضوعات ہی زیر ترجمہ آئے۔ شاہ ولی اللہ قادری نے ۱۷۰۴ء میں شیخ محمود کی ایک فارسی تصنیف "معرفت السلوک" کا اردو ترجمہ کیا۔ اسی دور میں سید محمد فاروق کے "طوطی نامہ" کا اردو ترجمہ ہوا اور ملا حسین واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہداء" کا اردو ترجمہ ۱۷۳۲ء میں فضلی نے "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" کے نام سے کیا۔ ۱۷۹۸ء میں فارسی کے "قصہ چہار درویش" کا ترجمہ میر عطا حسین تحسین نے "نوطرز مرصع" کے نام سے کیا۔ یہ ادبی کتاب تھی جسے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں تخلیقی عنصر یا کھلا ترجمہ کا فقدان رہا۔ عربی فارسی کی تراکیب بجنسہ رکھ لی گئیں البتہ کہیں کہیں سہل اور بامحاورہ عبارت آرائی بھی موجود ہے۔

۱۸ ویں صدی عیسوی میں فارسی عربی کے علاوہ انگریزی سے تراجم کا آغاز بھی مذہبی کتابوں مثلاً بائبل کے ترجمے سے ہوا۔ ۱۷۴۸ء میں کیا گیا بنجمن شلز کا "ترجمہ بائبل" بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک کھلا اور بامحاورہ ترجمہ ہے جو اس دور کی زبان میں کیا گیا۔

باقاعدہ ترجموں کا آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ۱۹ ویں صدی کے آغاز ہی سے ہوا۔ جہاں ترجموں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ ان میں ادبی، علمی اور مذہبی کتابیں موجود ہیں۔ جو زیادہ تر عربی، فارسی اور سنسکرت سے کی گئیں۔ ان تراجم کی ایک مجموعی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کھلے ترجمہ کے اصولوں پر پیش کی گئیں اور پہلے سے قدرے بہتر تراجم وجود میں آئے۔

۱۸۴۲ء میں تراجم کا تیسرا دور دہلی کالج میں شروع ہوا، جو ۱۸۷۷ء تک رہا۔ اس میں علمی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ حقیقت میں ان موضوعات پر یہ پہلی کوششیں ہیں۔ اس دور میں دہلی کالج سے باہر بھی لوگوں نے علمی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے کیے مثلاً ۱۸۵۳ء میں جان پارکس لیڈلی نے کتاب "ECONOMICS" کا ترجمہ "رسالہ علم المعیشت" کے نام سے کیا علمی ترجمے کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ اس دور کے مترجمین میں صہبائی کو اول سمجھی اس دور کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی اور علمی موضوعات کے علاوہ سائنسی اور علمی تراجم کا رجحان زیادہ رہا۔

۱۹ ویں صدی کے نصف آخر میں جو تراجم ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں ڈپٹی نذیر احمد کے دو تراجم بہت اہم ہیں۔ ایک ان کا "ترجمہ قرآن مجید" جو دہلی کی خالص اور ٹھیٹھ بامحاورہ زبان میں کیا۔ یہ ترجمہ عوامی روزمروں اور محاوروں کو اس حد تک اپنے اندر لیے ہوئے ہے کہ اکثر مقامات پر نہ صرف مذہبی تقدس کی حدود سے تجاوز کرجاتا ہے بلکہ بادی النظر میں تضحیک آمیز جملوں کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ دراصل قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے اندر ادبی شان بھی رکھتی ہے اور عوامی خطاب بھی، علمی مسائل بھی بیان کرتی ہے اور سماجی اور قانونی نکات بھی۔ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے اگرچہ بامحاورہ زبان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے لیکن عوامی لہجوں کی بجائے قدرے فصیح اور علمی عبارت آرائی کی ضرورت ہوتی ہے ڈپٹی نذیر احمد پیش رو شاہ عبدالقادر کی نسبت پہلی بار قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا ۱۸۵۴ء میں زراعت سے متعلق ایک کتاب کا ترجمہ کیا گیا۔ ۱۸۳۵ء

میں فقیر محمد گویا نے "انوار سہیلی" کا ترجمہ "بستان حکمت" کے نام سے کیا نیم چند کھتری نے ۱۸۳۷ء میں قصہ "گل و صنوبر" کا فارسی سے ترجمہ کیا مفتی سعد اللہ گلشن رامپوری نے ۱۸۰۳ء میں امام اعظم کے رسالے "فقہ اکبر" کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۸۴۷ء میں منشی عبدالکریم نے انگریزی سے "الف لیلیٰ" کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۵۹ء میں منشی چرنجی لال نے "تعلیم النفس" کے نام سے "نفسیات" کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا۔

اردو تراجم کا چوتھا دور سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی (۱۸۶۴ء) سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں سائنس اور علمی موضوعات پر ترجمہ کرنے کے لیے پہلی بار باقاعدہ مترجمین کا تقرر کیا گیا۔ اس سوسائٹی نے چالیس کے قریب کتابوں کا ترجمہ کیا اور ان کتابوں کی مجموعی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سرسید کے اس قول کو پیش نظر رکھا گیا کہ بات دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے یعنی کھلا ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو علمی کتابوں کے لیے موزوں تکنیک نہیں ہے۔ سرسید کی اس تحریک کے نتیجے میں تقریباً اتنے ہی دوسرے تراجم بھی وجود میں آئے۔ نذیر احمد ترجمہ کرنے میں تو کامیاب ہوئے مگر علمی ترجمہ کرنے کی بجائے بازاری اور سوقیانہ روزمروں اور محاوروں کی آمیزش سے ایک ایسی زبان میں ترجمہ کیا جس پر علمائے کرام کو ان کے خلاف آواز اٹھانا پڑی۔ دوسرا ترجمہ انھوں نے "تعزیرات ہند" کا کیا۔ قانونی کتابوں میں یہ سب سے پہلا ترجمہ ہے جو عرصہ تک قانونی اداروں میں استعمال ہوتا رہا۔ اس ترجمے نے بھی بہت سی قانونی اصطلاحات بھی وضع کیں جو آج تک ہمارے اردو ذخیرۂ قانون میں چلی آتی ہیں۔ مثلاً سول کے لیے دیوانی اور کریمنل (CRIMINAL) کے لیے فوجداری وغیرہ کے الفاظ ڈپٹی نذیر احمد نے دیے ہیں۔

۲۰ ویں صدی کے اوائل میں جو ترجمے ہوئے ان میں سید علی بلگرامی کی "تمدن ہند" اور "تمدن عرب" علمی ترجمے کی اہم اور خوبصورت مثالیں ہیں۔ یہ تراجم فرانسیسی سے اردو زبان میں کیے گئے۔ ان کے علاوہ مولوی سعید احمد دہلوی کی کتابیں اور مولانا ظفر علی خان کے تراجم بھی قابل ذکر ہیں۔

مولانا ظفر علی خان نے ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب "معرکہ مذہب اور

سائنس" کا اردو ترجمہ پیش کیا جسے ہم اردو میں متناسب اور خوبصورت ترجمے کی ترتیب اور تکنیک کے لحاظ سے ایک اہم مثال کہتے ہیں۔ بقول مولوی عبدالحق صاحب "جہاں مصنف کا زورِ قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے وہاں اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا۔" وہ لکھتے ہیں۔ "جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہٖ قائم رکھا گیا ہے اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث، دوسری زبان کی خوبی و فصاحت اور اردو کی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کو قائم رکھنا بہت دشوار تھا مگر مولوی ظفر علی خان نے جو درحقیقت قابلِ مبارکباد ہیں، اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے۔ لیکن یہ اس سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسے کہ فاضل مترجم کو حاصل ہے۔"

حیدر آباد دکن نے بھی اس طرف توجہ دی۔ خصوصاً نواب فخرالدین خان شمس الامراء نے سلسلہ شمسیہ کے تحت ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۶ء تک پہلا ذاتی دارالترجمہ قائم کیا اور یہیں سے ۲۲ کتابیں پیش کیں۔

اردو تراجم کا پانچواں دور انجمن ترقی اردو کے قیام ۱۹۰۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس انجمن نے علمی کتابوں کے تراجم پر زیادہ زور دیا۔ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" کے عنوان سے کیا۔ یہ ایک اہم علمی ترجمہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کے بعد سید سجاد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر یوسف حسین، منشی احمد علی اور ڈاکٹر سید عابد حسین نے انجمن کے لیے کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان میں سید ہاشمی فرید آبادی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ترجمہ اور تحریر کے باقاعدہ اصول وضع کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مترجم کی علمی استعداد کا بلند ہونا اور معیاری ادب سے خوب واقفیت کو ترجمے کی بنیادی شرط قرار دیا۔ انجمن کے یہ مترجمین اس شرط پر پورا اترتے تھے۔

۱۹۱۳ء ہی میں علامہ شبلیؒ نے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں تراجم کا ایک الگ سلسلہ شروع کیا جس میں فلسفہ اور نفسیات کی کتابیں زیرِ ترجمہ آئیں۔ ان تراجم میں علمی متانت کو برقرار رکھنے کی اس قدر کوشش کی گئی کہ تحریر کی سلاست اور شگفتگی عنقا ہو گئی۔

تراجم کا ساتواں اور اہم بالشان دور ۱۹۱۷ء میں پھر حیدر آباد دکن سے شروع ہوا۔ جب دارالترجمہ قائم ہوا اس میں باقاعدہ تنخواہ دار مترجمین نے سائنسی، انجینئری، طبی، قانونی، عمرانی اور تعلیمی علوم پر خاصے وسیع پیمانے پر ترجمے کیے۔ بقول مولوی عبدالحق صاحب "احیائے علوم کے لیے جو کام اگسٹس نے روم میں، خلافت عباسیہ میں ہارون الرشید اور مامون الرشید نے، سپین میں عبدالرحمان ثالث نے، بکرماجیت اور اکبر نے ہندوستان میں، الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹر اعظم اور کیتھرائن نے روس میں اور متسی ہیٹو نے جاپان میں کیا وہی فرمانروائے دولت آصفیہ نے اس ملک کے لیے کیا۔" اس دور کے تراجم پر میر حسن کی رائے قابلِ قبول ہے کہ دارالترجمہ کی مطبوعات نے اردو میں غیر معمولی وسعت پیدا کر دی۔ جدید علوم و فنون کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کر دیا اور علمی خیالات کے اظہار کے لیے گنجائش پیدا کر دی اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں اس سے روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی دور میں مولوی وحید الدین سلیم نے کتاب "وضعِ اصطلاحات" لکھ کر علمی ترجمے کی حدود کا تعین کرنے کی کوشش کی۔

اردو تراجم کے علاوہ حیدر آباد دکن میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی ایک قوی رو پیدا ہو گئی اور مذکورہ بالا موضوعات پر تراجم کی تعداد ہزاروں کو چھونے لگی۔ ان تراجم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر آباد دکن نے علمی ترجمے میں خاطر خواہ حصہ ادا کیا اور ادبیات میں بھی ادبِ عالیہ کو اردو میں منتقل کیا اس دور کے ترجمین کی فہرست بہت طویل ہے۔ بعد کے اداروں میں یہی رو کام کر رہی ہے۔

ادبیات عالیہ کے ترجمے کے سلسلے میں ۱۹۲۷ء سے ہندوستانی اکیڈمی اور اردو اکیڈمی کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہندوستانی اکیڈمی نے جرمن ڈرامہ نویس لیسنگ اور انگریز ڈرامہ نگار گالزوردی کے ناولوں کو اردو میں منتقل کیا۔ اسی طرح اردو اکیڈمی نے علمی کتابوں کے ساتھ ساتھ ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔ خصوصاً ۱۹۳۰ء کے بعد غیر ملکی افسانوں کے ترجمے عام ہونے لگے۔ یہ ترجمے دو طرح سے قارئین کے سامنے آئے۔ ایک تو کھلا ترجمہ اور دوسرے اخذ و استفادہ۔ منشی پریم چند سے لے کر سعادت حسن منٹو، عبدالمجید سالک، حسن عسکری، مولانا صلاح الدین احمد، سید عابد علی عابد، سید امتیاز علی تاج، صوفی تبسم اور ڈاکٹر تاثیر تک اس قسم کے مترجمین کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ترجمے کے میدان میں اخبارات و رسائل نے جو انبار لگا دیے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھلے ترجمے اور اخذ و استفادہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے، قدرے ادبی سلسلے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مگر علمی تراجم کی وہ روایت قائم نہیں رہی جس کا معیار حیدرآباد دکن میں قائم ہوا تھا۔ کراچی سے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو پاکستان اور لاہور میں مرکزی اردو بورڈ اور مجلس ترقی ادب نے اگرچہ اردو علمی ادبی تراجم کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان میں "معرکہ مذہب و سائنس" کے پائے کا کوئی ترجمہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ البتہ فنی ترجمے کی بعض تکنیکی سطحوں کے لحاظ سے جیمز فریزر کی کتاب "شاخ زریں" کا ترجمہ سید ذاکر اعجاز نے پیش کیا ہے۔ جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر فریزر کی طرح اس کتاب کے مصنف نے بھی علمی متانت اور ادبی چاشنی کے درمیان جس حسن توازن کو ملحوظ رکھا مترجم اسے ترجمے میں پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

جہاں تک قرآن مجید کے ترجموں کا تعلق ہے شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے بعد قابل قدر ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی نے کیا لیکن اس میں بھی لفظی تقدیم کو ملحوظ رکھا گیا اور سلاست و قطعیت کی کمی ہے۔ اس لحاظ سے اردو میں قرآن مجید کا خوبصورت ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا تھا۔ اس میں روانی پائی جاتی ہے۔ لیکن جدید دور میں سادہ اور عام فہم ترجمہ مولانا مودودی کا "تفہیم القرآن" ہے۔ جو بامحاورہ ترجمے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں ڈپٹی نذیر احمد کے عوامی سوقیانہ پن کی بجائے اردو کی روانی، سلاست اور قطعیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ ترجمہ بامحاورہ بھی ہے اور ادبی ترجمے کے اصولوں پر بھی پورا اترتا ہے۔

"ترجمے کی نسبت کسی کا قول ہے اور بہت سچ ہے کہ ترجمہ ایسی محنت ہے جو کسی کے شکریے کی مستحق نہیں یہ معقول مترجم کی ہمدردی میں کہا گیا ہے مگر اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شکریے کا مستحق دراصل مصنف ہے مترجم کا کام صرف اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا ہے اور یہ کوئی بڑا کام نہیں ---- میرا خیال ہے کہ جو لوگ ترجمے کو آسان سمجھتے ہیں اُن کو یا تو ترجمے کا تجربہ نہیں یا علم کی قدر نہیں۔

مترجم شکریے کا مستحق نہ ہو لیکن اگر دنیا میں مترجم نہ ہوتا تو روئے زمین پر علم کی جھیلیں اور دریا تو بہتے ہوتے مگر ان کو ملا کر علم کا بحر ناپید کنار بنانے والا کوئی نہ ہوتا"

(عنایت اللہ دہلوی)

ماهنامه
اخبار اردو
اسلام آباد

جلد: ۲ فروری ۱۹۸۵ء شمارہ: ۲

اس شمارے کے اہم مضامین

ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر مسئول

شریف کنجاہی
مدیر اعزازی

اختر راہی
نائب مدیر اعزازی

...درہ
...زبان
...م آباد